دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا تحقیقی رسالہ



# اردوئے معلّیٰ

قائد :



(۹۹)

سمد فاروقی

قیمت پانچ روپے

## مجلسِ ادارت



کتابت : زیدی
طباعت : یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی

# اُردوئے معلّیٰ دہلی

## قائم نمبر

شمارہ ۸

### فہرست

# شذرات

قائم نمبر ٹھیک اُس وقت پریس میں جا رہا ہے جب کہ انسان نے خلا میں تیر کر ایک نئے عہد کا آغاز کیا ہے۔ خلائی شناوری کے اِس دور میں یہ "گورکنی" کچھ اَن مل بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیا جائے تو اس جراٴتِ رندانہ کی اس سائنسی دور ہی میں سب سے زیادہ ضرورت ہے ـــــ بلاشبہ موجودہ تہذیب کی اصلی روح ' ایجاد و تسخیر میں مضمر ہے جس کی بدولت انسان کو کائنات پر ایسے تصرفات حاصل ہوئے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ ستاروں سے آگے' جہانوں کا کھوج لگانے اور اُن تک پرواز کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ خلا میں تیر سکتا ہے، عالمِ رنگ و بو کے ماورا جو چمن اور آشیانے ہیں، ان کا راز معلوم کر سکتا ہے؛ اس نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور ایک ایک کر کے ان سب رکاوٹوں کو دُور کر دیا ہے جو انسان کے لیے سنگِ گراں تھیں ـــــ لیکن یہ ساری تگ و دو ' یہ خلائی پرواز مقصود بالذات نہیں اور زندگی کا مقصد صرف پیسا اور روٹی نہیں ہو سکتا۔ ہماری بہیمیت اور موجودہ زندگی کا بحران اُسی وقت دُور ہو سکتا ہے' جب انسان' مادی زندگی کے حدود سے باہر نکلے اور وجدان و عرفان کے ذریعے ولایتِ عشق میں قدم رکھ سکے ـــــ اُردو کے شیوا بیان اور نکتہ رس شاعروں نے فطرت سے ربط' اتحاد اور ہم آہنگی کا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے احساسِ جمال کو حیات اور

کائنات کے سمجھنے کے لیے بطورِ قدر استعمال کیا ہے اور جذبے اور فکر میں ڈوبے ہوئے نغموں کو اِس آتش نوائی کے ساتھ گایا ہے کہ شعلہ سا لپک جاتا ہے، اور ہم تھوڑی دیر کے لیے نئی آگاہیوں کی حسین دنیا میں پہنچ جاتے ہیں ——— موجودہ دنیا کے ہنگامہ و آشوب میں ایسے لمحاتِ جمیل کا فراہم کر دینا یقیناً سعادت اور شرف ہے ؎

ہم نشیں ذکرِ یار کر کہ کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے
آج قائمؔ کے شعر ہم نے سُنے — ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

قائمؔ اسی انداز کی وجہ سے "شمعِ بزمِ معانی" سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ریختہ کو "خلعتِ قبول" بخشا اور اپنے "طورِ سخن" سے غزل کے گلدستے کو اونچی محراب پر سجایا بقول اُن کے اُن سے پہلے ریختے کا کوئی بڑا درجہ نہیں تھا بلکہ،

اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی!

لیکن افسوس ہے کہ اب تک ہم نے اس استادِ سخن کی طرف جیسی توجہ کرنا چاہیے تھی، نہیں کی۔ اُن کی زندگی اور شاعری کے بعض پہلو تحقیق کے محتاج ہیں۔ خاص طور پر ان کے وہ اشعار جو سوداؔ سے منسوب کر دیے گئے۔ عام خیال یہ ہے کہ ان کی مندرجۂ ذیل تخلیقات سوداؔ کے خوانِ یغما کی زینت ہیں:

(۱) ؎ ٹوٹا جو کعبہ، کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں، کہ بنایا نہ جائے گا

[غزل کا یہ شعر دیوانِ قائمؔ کے اس نسخہ میں شامل ہے جو ہمارے متن کی بنیاد ہے]

(۲) ع نخلِ امید کیونکے ہمارا ہو آہ سبز (یہ غزل بھی ہمارے نسخے میں موجود ہے)

(۳) ع شیخ تو نابود ہووے یا ترا پندار نیست (یہ غزل ہمارے

نیز مندرجہ ذیل منظومات :

(۴) ع سردی اب کے برس ہے اتنی شدید

(۵) ع سنا ہے کہ اک مرد آزادہ طور

(۶) ع ایک لڑکا پتنگ کا ہے کھلاڑ

(۷) ع سنا ہے کہ اک مرد اہلِ طریق

(۸) ع سنا جائے ہے اک مہوس کا حال

(۹) ع الٰہی شعلہ زن کر آتش دل

(۱۰) ع سلف کے زمانے کا تاریخ داں

لیکن کلیاتِ سوداؔ کے جو سات قلمی نسخے انڈیا آفس لندن میں ہیں، ان میں یہ منظومات سوداؔ ہی سے منسوب کی گئی ہیں۔

اس لحاظ سے یہ قائمؔ نمبر تشنہ ہے اور کسی طرح بھی لفظِ آخر کہلانے کا مستحق نہیں۔ تکمیل PERFECTION ہے بھی' TRIFLE DULL بے لطف اور بے نمک۔ بقول ماہم، بالکل فل اسٹاپ۔ جیسے ہم پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ جائیں۔ پھر وہاں سے بجز نیچے اترنے کے چارہ نہیں۔ تاہم یہ نمبر ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

---

پنڈت جی کے انتقال کو ہفتے اور مہینے گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک یہ زخم تازہ ہے اور نبا شد مہرش از جانم فراموش۔ ان کے انتقال پر رنج اور غم کے الفاظ معمولی نظر آتے ہیں، اُن سے ہمارے دکھ کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس رنج پر صبر بھی ایک قسم کی بے وفائی ہے، جسے گوارا نہیں کیا جا سکتا —— ہم آہنگی کا رشتہ بر... کے نہیں، ہمارے شعبۂ اردو کے بھی معمار تھے۔ یہاں

جو کچھ کام ہوا ہے، وہ سب اُسی چراغ کا پرتو ہے۔ ان کی میزانِ قدر میں اُردو کی بڑی اہمیت تھی اور جہاں کہیں ان کو کوئی تعمیری جذبہ نظر آتا تھا، اس کی وہ دل سے قدر کرتے تھے۔ اس کی اگر کوئی وجہ تھی تو صرف یہ کہ خود ان کی ذاتِ گرامی ہندوستان کی بہترین تہذیبی اقدار کی محرم اور محافظ تھی —— ان کے جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک روشنی تھی جو گُل ہوگئی، نئے ہندوستان کی تصویر کا ایک آئینہ تھا، جو ٹوٹ گیا، جلوۂ آفاق کی جھلک دکھلانے والا ایک ساغرِ جم تھا جو ہم سے چھین لیا گیا ؎

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

---

اس عرصے میں ہمارے شعبہ میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ناظم ذو لسانی لغت، ڈاکٹر محمد حسن ریڈر اور مولانا امیر حسن نورانی مہتمم نشر و اشاعت کا اضافہ ہوا ہے۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ان کے نفسِ گرم کی آمیزش سے ہمارے کاموں کو اور فروغ ہوگا۔

خواجہ احمد فاروقی

# قائم گارساں دتاسی کی نظر میں

قیام الدین علی جن کو شیخ محمد قائم بھی کہتے ہیں قصبہ چاند پور یا ندیا میں پیدا ہوئے لیکن وہ میر توپ خانہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر دہلی میں رہے۔ ابتدا عمر سے ان کو شاعری کا ذوق تھا اور وہ اپنے تخیل کی فراوانی اور اسلوب کی نفاست کے لیے مشہور تھے۔ اپنے ہم عصروں میں انھوں نے اپنی اصابت رائے اور ذہنی صلاحیت کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ علی ابراہیم اور لطف دونوں کا بیان ہے کہ انھوں نے ہندستانی شاعری کا آغاز میر درد کی رہنمائی میں کیا۔ جن سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ بعد میں وہ میر محمد رفیع سودا کے شاگرد ہو گئے۔ میر ان کو جانتے تھے۔ مصحفی کو ان سے کٹہرے میں نواب محمد یار خاں کے یہاں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ نواب موصوف ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ قائم اور مصحفی میں اتحاد ذوق کی وجہ سے بہت ربط تھا لیکن جب کٹہرے کی دولت کو زوال ہوا ، اور فیض اللہ خاں رام پور کے نواب ہوئے تو قائم مذکورہ صدر نواب کے بیٹے نواب احمد یار خاں کے ساتھ رہنے لگے ، جنھوں نے ان کو کئی فوجی مہمات میں شامل کیا۔

قائم کی غزلیات کا دیوان بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بڑی تعداد میں قصیدے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں اور ایک تذکرہ بھی لکھا ہے، جس کا ذکر مصحفی نے کلیم کے ترجمے میں کیا ہے۔ لطف کا بیان ہے کہ ان کا شاعرانہ کمال ان کی غزلوں اور مثنویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ علی ابراہیم رقم طراز ہیں کہ قائم سنہ ۱۱۹۴ھ (سنہ ۱۷۸۰ء) میں ان کے وطن کے قریب رہتے تھے۔ مصحفی جنھوں نے ان کا ترجمہ سنہ ۹۴-۱۷۹۳ء میں لکھا ہے، تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے سنا ہے کہ قائم کا رام پور میں انتقال ہو چکا ہے۔ کلیاتِ جرأت کے ایک نسخے میں جو میرے کتب خانے میں موجود ہے ایک قطعۂ تاریخ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قائم کا انتقال سنہ ۱۲۰۷ھ (سنہ ۹۳-۱۷۹۲ء) میں ہوا۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں قائم کے اشعار کا انتخاب دس صفحات میں اور میر نے چار صفحوں میں دیا ہے اور بینی نارائن جہاں نے ان کا ایک پورا مخمس نقل کیا ہے۔ میں ایک مختصر مثنوی کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جو علی ابراہیم سے ماخوذ ہے۔

[گارساں دتاسی: تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی
ص ۱۳۵ - ۱۳۷ جلد اول، طبع اول]

# دیوانِ قائم ـــــ لسانیاتی مطالعہ

عتیق احمد صدیقی

اٹھارویں صدی عیسوی نے اُردو زبان وادب کو جو نامور ہستیاں عطا کیں ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف اب تک کیا جا رہا ہے اور جب تک اُردو زبان زندہ ہے، ان کے کمال کو زوال نہ ہوگا۔ حاتم اور مظہر نے جن روایات کی بنیاد ڈالی ان کو میر و سودا اور ان کے دیگر معاصرین نے آگے بڑھایا۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق پر اُن باکمالوں کا نام آج تک اس حیثیت سے باقی ہے کہ انھوں نے اپنے فن میں خونِ جگر کی آمیزش کی اور اسے ایک ایسا رنگ دے دیا، جس نے وقت کے گرد وغبار میں بھی اپنی چمک دمک کو قائم رکھا ہے۔ جب کبھی گرد کی یہ تہ ہٹتی ہے تو حقیقت کی روشنی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

انھیں اربابِ کمال میں قائم کی شخصیت بھی ہے۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد۔ "ان کا دیوان ہرگز میر و میرزا کے دیوان کے نیچے نہیں رکھ سکتے۔" لیکن میر و میرزا کی نمایاں شخصیت اور ان کے فن کے سامنے قائم کا چراغ روشن نہ ہو سکا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان کے یہاں نہ سودا کی سی بلاغت و

جزالت ہے اور نہ میر کا سا سوز و گداز۔ جن راہوں پر یہ اساتذہ گام زن ہیں۔ قائم ان کے آس پاس سے گزرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے باوجود کہ ؎

ایک سودا کی تو قائم نہ کہوں میں ورنہ
ہے ترا طورِ سخن حدِ بشر سے باہر

وہ قدر و منزلت کی ان بلندیوں کو نہ چھو سکے جو ان اساتذہ کا حصہ تھیں۔ زمانے کی ناقدری کے باعث وہ شہرت سے گم نامی کی طرف جاتے رہے۔ تاریخ ادب کی کتابوں میں بھی ان کی شخصیت اور شاعری پر کافی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اعتراف کمال کے باوجود خود آزاد نے قائم کے احوال میں صرف چند سطریں (وہ بھی حاشیہ پر) لکھنے پر اکتفا کیا۔ غالباً اپنے اس اختصار کا جواز ہی پیش کرنے کے لیے انھوں نے اپنے مندرجہ بالا فقرے کے ساتھ یہ فقرہ اور اضافہ کر دیا کہ "مگر کیا کیجیے کہ قبول عام اور کچھ شے ہے، شہرت نہ پائی۔" بہر حال ان تمام امور کے باوجود ان کا کلام زیادہ توجہ اور تحسین کا مستحق تھا۔

قائم چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ایک عرصے تک دلّی میں بھی رہے۔ درد و سودا سے فنی استفادہ کیا۔ انھوں نے "بزبان دکنی" کہی ہوئی "بچری سی بات" کو اپنے ڈھنگ سے پیش کیا۔ یہاں ان کے شعری کمال سے قطع نظر ان کی زبان کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قائم کے دیوان میں اس عہد کی زبان کے تمام تر خصائص سمو لیے گئے ہیں لیکن ذیل میں جن خصوصیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان سے اٹھارویں صدی کی ادبی زبان کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اس مطالعے کے لیے یقیناً مزید مواد اور مزید تفصیلات کی ضرورت ہے، جس سے اس خاکہ کو

مکمل کیا جا سکے۔ سر دست صرف قائم کی زبان ہی زیر بحث ہے۔ اسی جز میں کل کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

## اصوات

صوتی اعتبار سے دیکھا جائے تو آج کی زبان کے مقابلے میں ان کے یہاں حرفِ علت کے استعمال میں چند اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس اختلاف کی تین نوعیتیں ہیں:

(۱) کسی حرکت (زبر۔ زیر۔ پیش) کو بڑھا کر حرف علت میں تبدیل کر دیا گیا۔
(۲) حرف علت کی تخفیف کر کے حرکت میں تبدیل کر دیا گیا۔
(۳) کسی لفظ پر حرف علت کا اضافہ کر دیا گیا۔

ضرورت شعری کے مطابق حروف علت کی تخفیف اور اشباع دونوں کو جائز رکھا ہے۔ اس میں کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی۔ ایک ہی لفظ کو بعض جگہ حرف علت کی تخفیف کے ساتھ استعمال کیا ہے تو دوسری جگہ بغیر تخفیف کے۔ یا کہیں طویل حرف علت کے ساتھ کسی لفظ کو استعمال کیا ہے اور دوسری جگہ بغیر طوالت کے۔ مثلاً

پھر کی بجائے پھیر ع کہ پھیر شعلہ نہ اپنے چراغ سے نکلا
" دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا
لہو " " لوہو ع بھر کے لوہو سے نہ جوں لالہ مجھے جام دیا
" ہو کے کب کا وہ لہو دیدۂ تر سے ٹپکا
کدھر " " کیدھر ع میں ہوں کیدھر کو پڑا آپ کدھر سوتے ہیں
اِدھر " " ایدھر ع ایدھر بھی تو ایک دم نظر کر
لگا " " لاگا ع ایک ذرہ ٹھیس اسے لاگے تو چکنا چور ہے

اُدھر کی بجائے اودھر   ع   دین و دنیا سے کچھ اودھر ہے قلندر کی ہوس
  ع   دل جائے سو کیدھر، اِدھر آب اور اُدھر آتش
تف " " توف   ع   توف اس بادہ پرستی پہ جو ہو کر بدمست
جدھر " " جیدھر   ع   جیدھر نظر کروں میں اودھر تو روبرو ہے
  ع   کھول کر آنکھیں جیدھر دیکھے تھا میں برسات تھی
جگہ " " جاگہ   ع   ایک جاگہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
مٹی " " ماٹی   ع   ایک مدت سے مری خاک کی ماٹی ہے خراب

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ تقریباً سب ہی الفاظ دہری شکلوں میں استعمال کیے گئے ہیں، یعنی حرکت کے اشباع کے ساتھ اور اس کے بغیر۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ شاہ حاتم اپنی تحریکِ اصلاحِ زبان کے سلسلے میں حروفِ علت اور حرکات کے اشباع کو ناجائز قرار دے چکے ہیں۔ لیکن شاید عوامی بولی کا اثر ہے کہ نہ ان کے ہم عصر بلکہ اگلی نسل کے لوگ بھی اس اصول کو پورے طور پر نہیں اپنا سکے اور یہ شکلیں عرصے تک جاری رہیں۔

ذیل میں ان الفاظ کی مثالیں درج ہیں جو حرفِ علت کی تخفیف کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

گویا کے بجائے گُیا   ع   یہ جب ہو سامنے اس کے گویا زبان نہیں
اوپر " " اُپر   ع   دائم اس عزم اُپر ہنستے ہیں ارماں میرے
رویا " " رُیا   ع   رویا تو تھا غمِ یوسف میں پیرِ کنعاں بھی
ہوئی " " ہو   ع   سحر ہوئی، رات بیتی، مے ہے شیشے میں وہی ساقی
کوئی " " کو   ع   گر یہی جھگڑے ہیں کوئی دم میں ہوئی جاتی ہے صبح
گئی " " گی   ع   کھلی رہ گئی ہوں بعد از ذبح جس نخچیر کی آنکھیں

حروف علت کی تخفیف و اشباع کے علاوہ کہیں کہیں ایک حرفِ علت کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

ع بغیر از آہ و افغاں کون قائم (افغاں بجائے فغاں)

ع خوشا آتش کہ جس کے گرد اس خوبی سے دھوواں ہے (دھوواں بجائے دھواں)

ع عجب اک پیچ دخم کے ساتھ اس عارض پہ رو واں ہے (رو واں بجائے رواں)

لفظ "نہیں" کو "ہ" کے ساتھ بھی استعمال کیا گیا ہے اور "ہ" کے حذف کے ساتھ بھی۔ گویا کہ یہ لفظ "نہیں" کے بجائے "نیں" ہے۔ ع

جا ہے یک زخم نہیں مرے تن پر

بعض الفاظ کے اعراب میں یکسانیت برقرار نہیں رہی ہے، بلکہ شاعر نے مختلف مواقع پر الفاظ کو مختلف حرکات کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

مثلاً سر کو سَر اور سِر

ع کہ پاؤں پر ترے رکھتی ہے زلف سَر گستاخ (قافیہ نظر، قدر ...)

ع اتنا ہی سر درد ہے جتنا کہ سِر (قافیہ مضر، منتظر ...)

طرح کو طَرح اور طرْح دونوں صورتوں میں استعمال کیا ہے۔

ع کہہ تو اے دل یہ ہے کہاں کی طرح (بہ فتح را)

ع کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں اپنے تو جل جانے کی طرح (بہ سکون را)

خضر کو خَضِر اور خِضْر:

ع موج سے آب خضر چیں بہ جبیں دیکھا ہے (بہ کسرِ "ض")

ع کہ غیر از خضر کے کوئی رہ ظلمات کٹتی ہے (بہ سکون "ض")

## تذکیر و تانیث

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں بھی آج کی معیاری زبان سے اختلاف

پایا جاتا ہے۔ مثلاً راہ، سوچ، پرواز، صبا وغیرہ کو مذکر نظم کیا ہے اور طرب، سیل، فہم وغیرہ کو مونث کے طور پر۔ اگرچہ جنس کا مسئلہ اس قدر مختلف فیہ رہا ہے کہ آج بھی علاقائی اعتبار سے اختلافات موجود ہیں، لیکن قائمؔ کے یہاں ایسے فرق زیادہ نہیں ہیں۔

جمع و واحد

اسماء کی جمع بنانے میں فارسی قاعدہ ("اں" کا اضافہ) بھی برتا گیا ہے۔ مثلاً بتاں، لباں، ہوشاں، خوباں، چہرویاں۔ مگر یہ صورت اکثر و بیشتر صرف اس وقت اختیار کی گئی ہے جب اسم کے ساتھ حرف مغیّرہ کا استعمال ہوا ہے۔

حرف علت "ی" پر ختم ہونے والے الفاظ کی جمع بنانے کے لیے موجودہ قاعدہ کے مطابق لفظ پر "اں" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ قائمؔ کے یہاں "اں" کے بجائے "یں" یا "ئیں" کا اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً گالی سے گالییں، دھجی سے دھجییں، مے آشامی سے مے آشامئیں، بدستی سے بدستئیں وغیرہ:

ع تیں ساتھ رقیبوں کے مے آشامئیں کیں رات

ع قائمؔ خدا کے واسطے بدستئیں یہ چھوڑ

ع جب گالییں نت کی کھائیں گے ہم

جمع بنانے کا یہ قاعدہ اب بھی بول چال کی زبان میں رائج ہے۔

"ہ" پر ختم ہونے والے فارسی الفاظ کی جمع، فارسی قاعدے کے مطابق "گاں" کے ساتھ بھی بنائی گئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس قاعدے سے انحراف بھی کیا گیا ہے:

ع ہاں مصیبت زدگاں کیوں نہ ہو آخر ہم ہیں

ع ہیں نقادوں کی یاوری میں عروج

ع تو دے تو کشتگوں کے ہر اک سمت لگ چلے

کشتہ کی جمع "کشتگوں" قابلِ غور ہے کہ اس میں فارسی اور اردو قاعدوں کا امتزاج کر دیا گیا ہے۔

خالص اردو جمعیں بھی استعمال کی گئی ہیں:

ع کھول مکھڑا تو نے ہم جلتوں کا چارا کیا کیا

ع آرے ہے دیکھ لڑکوں کی اکثر تینگ سرخ

ع تڑپھے نہ گراں باروں کی ہنگام غضب نبض

روزن کی جمع روزنوں بنائی گئی ہے:

ع پڑے ہے اس کی چتون سے کچھ ان روزنوں جنوں ٹپکا

ع اپنی ہستی بھی کچھ ان روزنوں گراں ! ہے اس کو

## حروفِ ربط

اس عہد کی زبان میں حروفِ ربط[1] "سے" کے علاوہ اسی کی دیگر شکلیں سیں، ستی، سیتی بھی رائج تھیں مگر قائم کے یہاں "سے" کے علاوہ صرف ایک شکل ستی ملتی ہے۔ اس کا استعمال بھی بہت کم ہوا ہے۔

ع بستی تو خوب تھی یہ نیک ظلم ستی اجڑ گئی

حرفِ ربط کا کہیں غیر ضروری طور پر بھی استعمال ہوا ہے اور کہیں اسے حذف کر دیا گیا ہے:

ع آج کو پاؤں بیچ چھالا ہے (کو زائد)

---

[1] باتباع مولانا عبدالحق

ع مینہ کے پیچھے دیر ٹپکے ہیں شجر بھیگے ہوئے (تک محذوف)

حرفِ ربط "کو" کہیں واؤ معروف کے ساتھ استعمال ہوا ہے :

ع کیا کہیے جو بات کو نہ سمجھے (قافیہ رفو، گفتگو " ")

تئیں کا استعمال ضمیر کے علاوہ حرفِ ربط کے طور پر بھی ہوا ہے۔ یہاں اس کے معنی "تک" ہوتے ہیں :

ع ہے یہ کیا ستم کہ تجھے سجن مری اب تئیں بھی خبر نہیں

ع دامانِ گل تئیں ہے کہاں دسترس مجھے

## ضمائر

ضمائر کے استعمال میں بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ قائم کے یہاں ضمیروں کی قدیم اور جدید دونوں شکلوں کا استعمال ہوا ہے۔ دراصل یہیں سے صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کس قدر سیّال حالت میں تھی۔ تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ الفاظ کی نئی شکلیں رفتہ رفتہ پرانی شکلوں کی جگہ لے رہی تھیں۔ لیکن ابھی تک قدیم شکلوں کو یکسر خارج از زبان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی لیے ان کا بے تکلف استعمال کیا گیا ہے۔ ضمیروں کی تقریباً وہ تمام شکلیں بھی قائم نے استعمال کی ہیں جو آج ہماری زبان میں رائج ہیں۔ یہاں صرف ان شکلوں یا ایسے استعمالوں کا ذکر ہی باعث دلچسپی ہوگا جو آج متروک ہو چکی ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ علامت فاعلی "نے" کا استعمال بھی اس وقت تک باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے اس سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں بھی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی جہاں "نے" کا استعمال ہوا ہے، ضمیر میں تبدیلی ہوئی ہے، ورنہ نہیں۔ ؎

مارا ہے وہ کس خستہ کو ایسا کہ مری جان
اب تک دمِ شمشیر خجالت سے عرق ہے

ضمیرِ شخصی کے صیغۂ واحد غائب کی فاعلی حالت میں "وہ" اور "وو" کے علاوہ تغیر شدہ صورت میں (سنے سے پہلے) ہر جگہ "ان" کا استعمال ہوا ہے:

ع کہ جز فریب کے ان نے کبھو صلا نہ دیا

اس امر کو محض اتفاق کہیے یا ان لوگوں کا احساسِ جمال کہ "س" پر ختم ہونے والی حالت فاعلی کی ضمیریں (اُس، جس، کس) "نے" سے قبل "ن" کے ساتھ استعمال کی جاتی ہیں۔ یعنی اس، جس، کس بالترتیب اُن، جن، کن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ضمیر اور علامت فاعلی کے ساتھ ساتھ استعمال ہونے کی صورت میں پہلے لفظ کی آخری اور دوسرے لفظ کی پہلی آواز ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو جاتی ہے۔ اس طرح زبان کو دو مختلف آوازوں ("س" کی صفیری آواز اور "ن" کی بندشی آواز) کے ادا کرنے کے بجائے صرف ایک آواز ادا کرنی پڑتی ہے۔ جس سے تلفظ کی آسانی کے ساتھ صوتی ہم آہنگی کے باعث ایک خاص قسم کا ترنم بھی پیدا ہو جاتا ہے:

ع کہ جز فریب کے ان نے کبھو صلا نہ دیا

ع جن نے پاؤں کو ترے ہاتھ لگایا اک بار

ع کیوں کر کہوں میں کن نے مرا دل کیا کباب

ضمیرِ شخصی غائب "ان" چونکہ واحد کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس لیے جمع کی حالت میں "انھوں" کی شکل اختیار کی گئی:

ع ہم اپنے جی سے عاجز ہیں، انھوں کو عیش سوجھے ہیں

ضمیرِ شخصی حاضر کی فاعلی حالت میں "تیں" کا استعمال بہت عام ہے۔ یہ لفظ "تو" یا "تو نے" کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ محض "تو" کی جگہ کہ جہاں "تو" محذوف ہوتا ہے۔ مگر بالعموم "تو" کے ساتھ "نے" کو حذف

نہیں کیا گیا، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ یہ لفظ " تو نے " ہی کا قائم مقام ہے:

ع پامال اسے کیا جو فلک اس طرح سے تیں

ع کیا کیسے اپنے ہاتھ سے تیں کام کھو دیا

ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جہاں صرف " تو " کے معنی اخذ ہوتے ہیں:

ے قائمؔ نہ میں کہا تھا کہ مت پی شرابِ عشق
کھینچے ہے اب خمار سے تیں دردِ سر کہ ہم

صیغۂ واحد حاضر کی حالت اضافی میں کئی مختلف لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ تیرا، ترا، تجھ، ترے کی، تجھ کا استعمال بہ کثرت ہے:

ع ناخن ترے کی مہندی سے تنہا نہیں ہیں داغ

ع گذری تجھ عہد میں تو عجب درد و غم کے بیچ

ع وابستہ تجھ لباں سے ہے میرا سخن ہنوز

صیغۂ حاضر کی طرح سے ہی صیغۂ متکلم میں بھی واحد شخصی ضمیروں کے لیے حالت اضافی میں کئی الفاظ آئے ہیں۔ میرا، مرا، مجھے، مجھ:

ع قائمؔ نہ مجھ مزار پہ روتی ہے ایک شمع

ع عار ہے ننگ کو مجھ نام سے سبحان اللہ

ے بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائمؔ
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ضمیر استفہامی کی حیثیت سے دیگر ضمائر کے علاوہ ایک ضمیر " کو " (واؤ معروف کے ساتھ) استعمال ہوئی ہے۔ گاہے فاعلی حالت میں (بہ معنی کون) اور گاہے حالت اضافی میں (بہ معنی کس کا)۔ اس لفظ کا ماخذ قدیم ہندی یا برج بھاشا ہے۔ جہاں یہ کون کے معنی دیتا ہے۔

ع وہ حوصلہ کو' کہ مثلِ گرداب

ع جب مٹ گیا نشان تو کو نام رہ گیا

ضمائرِ اشارہ میں " وِس " اور " تس " مخصوص استعمال ہیں۔ اول الذکر رہ بعید کے لیے اور آخر الذکر اشارہ قریب کے لیے۔ جن کے لیے موجودہ میں اُس اور اِس استعمال کی جاتی ہیں :

ع تس پہ ہوا یہ بات خلل یک نہ شد دو شد

ع بے وفا تجھ سا جو ہو کیا کیجے وِس سے اختلاط

ضمیرِ تنکیری میں "کسی" کے ساتھ "کسو" کا بھی استعمال عام طور پر ہوتا :

ع کسو کا دل ہے وہ جن نے یہ انتقام لیا

ع گذرا وہ شب، پہ نہ مارا کسو نے دم

ضمائر کے بعض استعمال بڑے دل چسپ اور عجیب ہیں :

ع چھوڑ تنہا مجھے یا رب انھیں کیوں کر گذری

ع ورنہ کچھ آپ کو گلشن سے سروکار نہ تھا (آپ کو: متکلم کے لیے)

ع صدقے میں کچھ تو بول تو کیا تجھ پہ حال تھا

ع بندے ہیں تمھیں ہزار مجھ سے

ع آئے ہے اب تو آپ کو بھی ہراس (آپ کو: متکلم کے لیے)

میز[1]

تمیز مکانی میں عام مستعمل الفاظ یہاں (یاں)، وہاں (واں) کہاں، ہیں وغیرہ کے علاوہ جو الفاظ استعمال کیے گئے، اور جواب رائج نہیں ہیں،

---

[1] قدیم اصطلاح ظرف

مندرجہ ذیل ہیں :

کہوں بہ معنی کہیں : ع کسو کی آنکھ سے گر خاک پر آنسو کہوں ٹپکا

ع جو قطرہ چشم سے میری ترے اوپر کہوں ٹپکا

کو بہ معنی کہاں : ے کو جامۂ خاک و خوں کہ قائمؔ

سمجھتا تھا وہی لباس مجھ کو

اس لفظ کی دو ممکن توجیہیں ہو سکتی ہیں :

(۱) یہ لفظ واو معروف کے ساتھ فارسی ہے، کو = کہاں

(۲) یہ لفظ واو مجہول کے ساتھ ہے، جو قدیم ہندی کا لفظ ہے اور جس سے کون اور کہاں کی شکلیں وجود میں آئیں۔

لیکن واضح وجوہ نہیں کہ ہر دو توجیہات میں سے کسی ایک کو ترجیح دی جا سکے۔

بعض جگہ "کہیں" بہ حذف "ہ" استعمال ہوا ہے :

ع ستم ہوتا جو کہیں جامہ ترا اے گل بدن پھٹتا

ع یوں بھی کہیں ہووے ہے بے درد بروں بردن دل

تیسر زمانی میں "تد" بہ معنی تب یا تو استعمال ہوا ہے۔

ع سارے ہوے سفید پہ تد بھی جواں رہے

تیسری لفظ کیوں کر (کس طرح) کو کہیں کیوں کر اور کہیں کیوں کہ استعمال کیا ہے۔ اس میں کسی خاص قاعدے اور وجہ کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ضرورت شعری کے مطابق ہر دو شکلوں کا استعمال کیا ہے :

ع پوچھ نہ قائمؔ کہ کٹی کیوں کہ عمر

ع چھوڑ تنہا مجھے یارب انھیں کیوں کر گزری

## فعل

فعل کو ہر زبان کی گرامر میں بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اردو فعل
پنی اہمیت کے ساتھ ساتھ کافی پیچیدہ بھی ہے۔ تاریخی طور پر بھی اس میں
نی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ قائمؔ کی زبان میں اس تدریجی ارتقا کے مختلف
نامات سامنے آجاتے ہیں۔ ذیل میں انھیں کی طرف کچھ اشارات ہیں:
فعل حال کے بنانے میں گا ہے حالیہ ناتمام کا استعمال موجودہ صورت
کے مطابق کیا گیا ہے: ع

جس طرح گھر میں کرتے ہیں نادار کا علاج

یکن کثیرالاستعمال شکل یہ نہیں، بلکہ قدیم شکل ہے، جس میں فعل حال موجودہ
ضارع اور فعل معاون کی ترکیب سے بنتا ہے:

ع کہے ہے کل کے تو آنے کو، آج یاں شب تک
ع جلے ہے جن کی اسیری پہ دل رہائی کا

اس قاعدے سے "جانا" مستثنیٰ ہے۔ اس سے فعل حال مضارع
ں ترکیب سے نہیں بنایا جاتا، بلکہ صرف مادۂ فعل استعمال کیا جاتا ہے:

ع ایک چشمک میں گذر جا ہے یہ سب شیب و شباب
ع یاد آجا ہے مجھے اس کے وہ جھنجھلانے کی طرح
ع جیتے جی جا ہیں کوئی ہم ترے گھر سے باہر

یکن ایک دو مثالیں ایسی بھی مل جاتی ہیں، جن میں قاعدۂ اول کا اتباع
لیا گیا ہے:

ع کہ کوئی جائے ہے ناداں یہ تیرے ساتھ پرے جا
ع طریق عشق میں کہہ بوالہوس سے جائے ہیں سر

فعل حال کی جمع کی شکل میں اصل فعل (مضارع) اور معاون فعل دونوں
کو جمع لاتے ہیں۔

ع مارین ہیں ہم نگینِ سلیماں کو پشت دست
ع اڈیں پھریں ہیں ابر شفق گوں تو چادر اوڑھ
ع جو کچھ کہ لیں ہیں کسی سے یہ داب رکھتے ہیں

لیکن "ہونا" اور "جانا" سے بننے والے افعال اس قاعدے سے مستثنیٰ
قرار دیے جا سکتے ہیں:

ع دکھلا دوں میں کہ ہو ہیں یہ جاں بازیوں کے ڈول
ع اب گذر جا ہیں یہ دو چار جو باقی دم ہیں
ع مانعِ گرمیِ دل ہو ہیں کہیں موئے سفید

فعل ماضی کی شکلوں کو بھی زمانۂ ماضی کے ساتھ فعل حال کی صورتوں
پر ہی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ سواء اس کے کہ "مرنا" سے ماضی مرا کے بجائے
"موا" بنایا گیا ہے:

ع موا مجنوں تو اک مدت ہوئی پر اب تک اس غم میں

ماضی میں ہی فعل کا ایک استعمال بڑا عجیب ہے:

ع سوچے تھا میں قافیہ کو قائم
ع کھول کر آنکھیں جدھر دیکھے تھا میں برسات تھی

فعل حال اور ماضی میں "ہونا" سے ہر جگہ مضارع کی شکل "ہو" استعمال
کی گئی ہے۔ لیکن جہاں محض مضارع کے طور پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس
میں قدیم شکل "ہوئے" یا "ہووے" کو برتا گیا ہے:

ع اگرچہ نیم نفس سے بھی ہوئے کم جینا

ع دیکھیں کیا ہوئے یہی گر مژۂ پرنم ہیں

ایک آدھ موقعہ پر مضارع کے آخر کی "ے" محذوف کر کے محض مادۂ فعل مضارع کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت مصدر "جانا" کے ساتھ ہی مخصوص ہے:

ع کیونکہ جا دل سے اس نگہ کی یاد

ع سوالِ بوسہ جو قائم وہ مان جا ہے تو خیر

ع دل یوں ہی مفت دیا جا ہے غضب کرتے ہو

فعل مستقبل میں علاوہ بریں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں کہ اس میں "ہونا" سے صیغہ بناتے وقت بھی قدیم شکل مضارع کو قائم رکھا گیا ہے۔ آج کل صرف مادۂ فعل "ہو" میں علامت مستقبل کا اضافہ کر دیا جاتا ہے:

ع ذخیرہ ہوئے گا ہر گھر کے اندر آہ و نالے کا

ع کیا جانیے کیا ہوئے گا انجام کسی کا

ساتھ ہی اکثر مضارع سے مستقبل کا کام بھی لیا گیا ہے:

ع طبیب اس کو کہوں میں جو مرے احوال کو پہنچے

حالیہ معطوفہ میں حرف عطف کی دونوں شکلیں "کر" اور "کے" استعمال کی گئی ہیں:

ع سن کے شور اس لب شکر خا کا

ع موئے ہم آب و دانہ کو ترس کر

اکثر حرف عطف کو حذف بھی کر دیا گیا ہے:

ع کبھی کا خون ہو آنکھوں سے گر گیا ہوگا

ع چلا جب دل میں لے کو حسرے اس سے یہ لگا کہنے

امر تاکیدی کے لیے آج کل کی اُردو میں مصدر کا استعمال کیا جاتا ہے۔
قائمؔ کے یہاں اس مقصد کے لیے مادۂ فعل کے آخر میں "یو" یا "جو" یا "جیو" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ پہلی شکل اس صورت میں کہ مادۂ فعل حرف صحیح پر ختم ہو جاتا ہے۔ "ا" یا "د" پر ختم ہونے کی صورت میں "ئیو" کا اضافہ ہوتا ہے۔

"ی" پر ختم ہونے والے مادۂ فعل کے بعد "جو" یا "جیو" بڑھایا جاتا ہے۔

ع پر دیکھیو لیتا ہو اگر نام کسی کا
ع کسی سپاہی پسر کو نہ دیجو دل قائمؔ
ع ہم نشیں کیجیو تقریب تو شب باشی کی

## قوافی

زبان کے استعمال کا یہ صحت مند رجحان کہا جا سکتا ہے کہ بعض فارسی یا عربی کے وہ الفاظ جو "ہ" پر ختم ہوتے ہیں "ا" کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ اور "ہ" کو "ا" کا ہم قافیہ گردانا گیا ہے۔ مثلاً مدعا کا قافیہ مرتبا، معاملا، مرثیا بے تکلف برتا گیا ہے۔ اسی طرح کھانا، جانا کا قافیہ زمانا، شرابخانا اور آشیانا باندھنے میں کوئی تکلف نہیں کیا گیا۔ پیارا کا قافیہ آوارا اور زنا کارا جائز رکھا گیا ہے۔

قوافی کے سلسلے میں معروف اور مجہول آوازوں کے فرق کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مور، شور کا قافیہ مقدور، مشہور اور خو، بو کا قافیہ دو، سو باندھا گیا ہے۔

## علامت فاعلی "نے"

علامت فاعلی "نے" کا استعمال ضمائر کے ساتھ بے قاعدہ ہے۔ کہیں اس کا استعمال ہوا ہے اور کہیں نہیں۔

ع کیا بگاڑا تھا میں اس گنبد مینائی کا

ع سنا تھا ہم بھی کہ ہے شہد زندگی شیریں

ع عوض طرب کے گذشتوں کی ہم نے غم کھینچا

ع جانیے کون سے جنگل کو تو آباد کیا

لیکن ان صورتوں میں کہ جہاں فاعل ضمیر نہیں، بلکہ اسم ہے "نے" محذوف نہیں ہوا۔ ایسے موقعوں پہ ہر جگہ اس کا استعمال کیا گیا ہے۔

ع رخت باندھا نہ کس اندوہ و خوشی نے دل سے

ع یہ گل کے چھیڑتے آہ و فغاں کی بلبل نے

## متروکات

ایسے الفاظ جو اب متروک ہو چکے ہیں، قائمؔ کی زبان میں زیادہ نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے عہد کی زبان میں خود کوئی جدت و اختراع کی یا مروجہ الفاظ کے استعمال سے اجتناب و احتراز کیا۔ لیکن پھر بھی وہ الفاظ کے استعمال میں محتاط معلوم ہوتے ہیں۔ وہ میرؔ کی طرح زبان میں تصرف نہیں کرتے۔ ایسے الفاظ کی ایک فہرست درجِ ذیل ہے:

ٹک = ذرا

جوں = جیسے، جس طرح، مثل

کبھو = کبھی

جھاڑ = بارش (بالخصوص موسلا دھار بارش) گالیوں کی جھاڑ باندھی قصد سرگوشی میں رات

اوجھل = پیچھے
آٹالا = سامان    اک ترے غم ہی کا اس گھر سے آٹالا نہ گیا
تئیں = خود، میں، تک
بندھوا = قیدی    بندھوا تری نگہ کا جنے کیا بہ کامِ دل
تنک = ذرا سا
نمط = (کی) طرح
باؤ = ہوا
چھٹ = علاوہ
کسو = کسی
دہا = عشرہ، عشرۂ محرم
گھور = میل    ۵ دردِ دل سمجھے ہے وہ صندل سیائے بتاں
جس کو پیشانی کا آیا ہے تری گھور پسند
تڑبھوں = شوخی چشمک    تڑبھوں سے اس نگاہ کی دل کو پڑا ہے کام
لگو نہیں = خوش نما، پر کشش    لگو نہیں شکل تو ہے گل کی لیک خوب نہیں
چھب = زینت    دل کو بھانتا ہے ہر اک عضو کی تیرے چھب نے
تھونی = ٹیک، ستون    رکھا ہے جن نے فلک کو بغیر تھونی تھام
مانا، ساں = مانند
کھاگ = سینگ    خلصے گینڈے ہیں جو پیشانی میں اک کھاگ لگے
نس = رات    کب گریہ سے قائمؔ کو سروکار تھا نس دن
چواؤ = تذکرہ    یارجس نوح کے طوفان کا کرتے ہیں چواؤ
اسی ضمن میں ان مصادر کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے، جو اب متروک ہو چکے ہیں

لیکن اگر ان کا استعمال جاری رہتا تو یہ وسعت زبان کا باعث بنتے۔ ان میں سے بعض یقیناً ایسے ہیں جن کا اب تک کوئی بدل موجود نہیں۔ ان کے ذریعے جن مخصوص معنیٰ کا اظہار ہوتا ہے اور احساس کی جن لطیف کیفیتوں کی یہ نمائندگی کرتے ہیں، ان کے بیان کے لیے مرکب مصادر یا تراکیب سے کام لیا جاتا ہے۔ ان کے ترک سے زبان کے مترادفات کی تعداد کم ہوئی ہے۔ ایسے بعض مصادر درج ذیل ہیں :-

| | |
|---|---|
| تجنا = چھوڑنا | کس بھروسے پہ دلا اس کو تجا تھا تو نے |
| ڈھبانا = ڈھنگ پر لانا | { ڈھب چڑھے گا تو کچھ ڈھبایئے گا<br>{ یاں ڈھب تو ڈھبانے کے بہت یاد ہیں لیکن |
| سچکنا = کنجوسی دکھانا | کیوں سچکتا ہے تو اک بوسے کے دیتے اللہ |
| چھلنا = دھوکہ دینا | جن نے لاکھوں تسکاریوں کو چھلا |
| ایچنا = بہانا، پانی بہانا | رو کے تھمتا ہے تو جس دم تو ایچے ہے آب |
| موندنا = بند کرنا | مت دوپٹہ سے میاں چہرے کو اتنا کھول موند |
| چھیجنا = برباد کرنا | دولت خدا نے دی بھی تو اتنا نہ چھیجیے۔ |
| دلکنا = لرزنا۔ شوق ہونا | سن کر جسے نہ قیس کی چھاتی دلک گئی |
| رمانا = پرورش کرنا۔ رام کرنا | کہ ایک عمر میں یہ فاحشہ رمائی ہے |
| بگنا = چلنا | شاید کبھی اس کھیت میں تلوار بگی ہے |
| کہانا = کہلانا | قائمؔ ہی نہ پھر کہائیں گے ہم |

بعض مصرعوں کی بندشیں ایسی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے محض وزن شعر کو پورا کرنے کے لیے بعض لفظوں کو کھپایا گیا ہے۔ اس میں از روئے بلاغت تعقید کا سقم بھی ہے اور قواعد کے اعتبار سے الفاظ کے استعمال کی ناہمواری بھی :

ع ہمارا سر تری سی طرح کاش اسے کوہکن پھٹتا

ع قائمؔ اب عشق میں پھنس چک کے جو ڈھونڈے ہے نجات

یہاں "تری سی طرح" میں "سی" اور "پھنس چک کے" میں "چک" زوائد میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن قائمؔ جیسے شاعر کے یہاں ان کا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانے میں زبان ایسے استعمالات کی اجازت دیتی تھی۔

سطور بالا میں قائمؔ کی زبان کی جن خصوصیتوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، وہ اٹھارویں صدی کی معیاری زبان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں بعض الفاظ یا الفاظ کے بعض استعمال علاقائی اثرات کا بھی نتیجہ ہو سکتے ہیں جن میں مغربی یو۔پی کی بول چال کی زبان یعنی کھڑی بولی کو اہمیت حاصل ہے کہ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن دتی میں ایک زمانے تک رہنے اور دردؔ و سوداؔ جیسے اساتذۂ فن سے اکتساب کرنے کے بعد ان علاقائی اثرات کا کم ہو جانا لازمی تھا۔ بالخصوص جب کہ اس دور کے شعرا زبان کی صحت و صفائی کا خیال رکھتے تھے، بعض اوقات نفسِ مضمون سے بھی زیادہ۔ اسی لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تامل کی گنجائش نہیں کہ دیوانِ قائمؔ میں مستعمل زبان اُس زمانے کی معیاری زبان کی نمایندہ ہے۔

# دیوانِ قائم

دیوانِ قائم کا متن، دو نسخوں کی مدد سے مرتّب کیا گیا ہے: (۱) نسخۂ انڈیا آفس لائبریری لندن (۲) نسخۂ رضا لائبریری رام پور۔ نسخۂ لندن کے لیے (ل) اور نسخۂ رام پور کے لیے (م) بطور مخفّفات استعمال کیے گئے ہیں۔

نسخۂ لندن میں غزلیات کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن بھی ہیں۔ ہم نے فی الوقت صرف حصۂ غزلیات کو مرتّب کیا ہے۔ نسخۂ لندن بہت صاف لکھا ہوا ہے۔ اغلاطِ کتابت نسبتًہ کم ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر الفاظ کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ اس نسخے کے آخر میں ایسی کوئی صراحت نہیں، جس سے کاتب کا نام یا سنہ کتابت معلوم ہو سکے۔ ہاں آخر میں ایک مثنوی ہے جس کا عنوان ہے "قصۂ نٹ مسمّیٰ بحیرت افزا" یہ اس مجموعے کی آخری مثنوی ہے۔ اس کے خاتمے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: "تمام شد مثنوی حیرت افزا تصنیف میاں قائم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ" اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے کی کتابت قائم کی زندگی میں ہوئی ہے۔

جگہ جگہ متن میں کسی مصرع یا لفظ پر ن (علامتِ نسخہ) بنا کر حاشیے میں اس کا بدل لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں لفظ "بدل" لکھ کر حاشیے میں پورا مصرع لکھا گیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کم از کم دو نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

اس نسخے میں کسی دوسرے شخص نے بھی جگہ جگہ حواشی میں اشعار یا مکمل غزلوں کا اضافہ کیا ہے۔ یہ شخص بدخط اور غلط نویس ہے۔ ہم نے اس مجموعے میں ان اشعار کو بھی شامل کر لیا ہے۔

نسخۂ رام پور میں، نسخۂ لندن کے مقابلے میں کلام کم ہے۔ البتہ م کی کچھ غزلوں میں ایک یا ایک سے زیادہ اشعار وہ ہیں جو ل میں نہیں ہیں۔ ہم نے ان اشعار کو بھی شاملِ متن کر لیا ہے اور حاشیے میں ان کی نشان دہی کر دی ہے۔ اختلافِ متن کی صورت میں ل کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔ حاشیے میں اس کی صراحت بھی کر دی ہے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن کا متن ل میں صریحاً غلط ہے۔ ایسے مقامات پر م کے متن کو ترجیح دی گئی ہے اور حاشیے میں اس کو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ بعض اہم الفاظ کے سوا بالعموم املا کے مروجہ انداز کو اختیار کیا گیا ہے۔

آج قائم کے شعر ہم نے سُنے
ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

## مطبوعات شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور | | قیمت بیس روپے |
| ۲۔ کربل کتھا (دہ مجلس) فضلی | | " چھ روپے |
| ۳۔ ماسٹر رام چندر | | " آٹھ روپے پچاس پیسے |
| ۴۔ اُردوے معلیٰ | غالب نمبر حصۂ اوّل | " تین روپے |
| ۵۔ اُردوے معلیٰ | غالب نمبر حصۂ دوم | " پانچ روپے |
| ۶۔ اُردوے معلیٰ | لسانیات نمبر | " پانچ روپے |
| ۷۔ اُردوے معلیٰ | میر سوز نمبر | " سات روپے |
| ۸۔ اُردوے معلیٰ | قائم نمبر | " پانچ روپے |

# یافتاح

## ربِّ یسّر بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم وتمّم بالخیر

ہرگز نہیں مقدور، تری حمد، زباں کا
بُرہان ہے دعوے کی، مرے عجزِ بیاں کا

جب تک کہ ہے تو، ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ
جوں[1] موج گُہر نت لازمہ ہے آبِ رواں کا

اے عشق! مرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا
ہر سر متحمل نہیں اس بارِ گراں کا

تک فہم ارادت سے برہمن کے سمجھ شیخ
کیا کم ہے خدا سے ترے ہنگامہ بتاں کا

دل! پردے میں کہہ رمزِ حقیقت، کہ مبادا
محرم ہو کوئی غیر ترے رازِ نہاں کا

اے غافلِ فرصت! یہ چمن مفت نظر ہے
پھر فصلِ بہار آئے، نہ موسم ہو خزاں کا

پوشیدہ ہے جوں[2] بو، وہ ہر اک رنگ میں قائم
دیکھے تو اگر غور سے گلزار جہاں کا

---

مقدور کسے نعتِ پیمبر کی رقم کا
ہر دم ہے دمِ تیغ پہ یاں راہ قلم کا

گُل گشتِ دو عالم سے ہو کیوں کر وہ تسلّی
زائر ہو جو کوئی ترے کوچے کے ارم کا

گو خضر تھا، منزل کو نہ مقصود کی پہنچا
جویا نہ ہوا یاں جو ترے نقشِ قدم کا

امکان نہ تھا ممکن و واجب کو سمجھنا
مظہر جو نہ ہوتا تو حدوث اور قِدم کا

ہے جرمِ نکردہ کی مرے عفو خریدار
تا گرم ہے بازار تری بیعِ سلم کا

کیا دور، جو بخشش پہ کریں ناز جرائم
جس روز کہ شافع ہو تو اعمالِ اُمم کا

یا ختمِ رسُل! گرچہ گنہ گار ہے قائمؔ
پر اُس کو بھروسا ہے ترے فضل و کرم کا

---

[1] [2] م، جیوں

اٹھ جائے گریہ بیچ سے پردہ حجاب کا — دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا

کیوں چھوڑتے ہو دُردِ تہِ جام مے کشو! — ذرّہ ہے یہ بھی آخر اُسی آفتاب کا

ایسی ہوائیں، پاس نہ ساقی، نہ جام مے — رونا بجا ہے حال پہ میرے سحاب کا

ہونا تھا زندگی ہی میں مُنہ شیخ کا سیاہ — اس عمر میں ہے ورنہ مزہ کیا خضاب کا

اِس دشتِ پُر سراب میں بھٹکے بہت، پہ حیف — دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانا تھا آب کا

زاہد، مریضِ عشق پہ ہو شربِ مے حرام! — پائے یہ مسئلہ ہے تری کس کتاب کا

[۱] افتادگاں کی پستیِ ہمّت پہ تو نہ جا — ہے سائبانِ عرش پہ ہاتھ اس طناب کا

[۲] جوش سرمہ کیوں نہ چشم میں قائم کی [۳] ہو جگہ
آخر وہ خاکِ پا ہے شہِ بوتراب کا

---

وہی معنی ہیں، گو دھوکھا ہے صورت کے ازالے کا — اگر ژالہ ہو پانی سے، وگر پانی ہو ژالے کا

خط آیا اُس کے، دیکھیں گریہ کیا طوفان لادے گا — ہے یہ آثار سے بارش کے، ہونا مہ پہ ہالے کا

[۴] خطِ نورستہ چہرے پر ترے کیا خوب لگتا ہے — ہے گویا گردِ ماہِ چاردہ کے دَور ہالے کا

فلک کی قید میں پھنستے ہیں کب [۵] شہبازِ ہمت کے — طرح مکڑی کے گو پورا ہے اُن نے دام جالے کا

بدن سے گریہ جذبِ خوں طرف آنکھوں کے کرتا ہے — ہے اُلٹا ضابطہ یاں کے طبیبوں کے اُمالے کا

بہت سا غور کو مت دخل دے نسخے میں عالم کے — کہ حاصل دور ہے نظروں سے تیری اس رسالے کا

اگرچہ چاہ یو [۶] نہیں شیون کا ہے یاروں میں تو اب کے — ذخیرہ مٹنے گا ہر گھر کے اندر آہ و نالے کا

نہ رکھو قائم معرّا داغ سے صفحے کو سینے کے
کہ مُہریں جس قدر ہوں، حسن ہے اتنا قبالے کا

---

[۱] یہ شعر "ل" میں نہیں ہے [۲] م: جیوں [۳] م: کو [۴] یہ شعر "ل" میں نہیں ہے
[۵] م: کم [۶] م: یہی۔

دل پا کے اُس کی زلف میں آرام، رہ گیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام، رہ گیا

جھگڑے میں ہم مبادی کے یاں تک پھنسے کہ آہ
مقصود تھا جو اپنے تئیں کام، رہ گیا

ناپختگی کا اپنی سبب اُس ثمر سے پوچھ
جلدی[۱] سے باغباں کی جو وہ خام رہ گیا

صیاد! تو تو جا ہے، پر اُس کی بھی کچھ خبر
جو مرغِ ناتواں کہ تہِ دام رہ گیا

قسمت تو دیکھ، ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ماریں[۲] ہیں ہم نگینِ سلیماں کو پشت دست
جب مٹ گیا نشان تو کو نام رہ گیا

نے تجھ پہ وہ بہار رہی اور نہ یاں وہ دل
کہنے کو نیک و بد کے اک الزام رہ گیا

موقوف کچھ کمال پہ یاں کامِ دل نہیں
مجھ کو ہی دیکھ لے نہ، کہ ناکام رہ گیا

قائمؔ گئے سب اُس کے زباں سے جو تھے رفیق
اک بے حیا میں کھانے کو دشنام رہ گیا

---

نہ جوں حباب تو دم کھا حیاتِ فانی کا
کہ بیٹھ جاہے یہ اب بلبلا سا پانی کا

نہ چھوڑ ساتھ سے اے مرغِ تیز پر مجھ کو
کہ تازہ ربط کیا ہے میں پرفشانی کا

نہالِ قامتِ نوخیز ہوئے گا اک چیز
پہ یاں دماغ کسے اتنی باغبانی کا

ہے ایک تارِ گریباں کی اوٹ میں تنِ زار
زبس ہجوم ہے جامے پہ ناتوانی کا

کبھے ہے کل کے تو آنے کو، آج یاں شب تک
کب اعتماد کسی کو ہے زندگانی کا

نہ ایک پند ہے واعظ کی مورثِ غفلت
خواص بھی تو سنا ہے یہی کہانی کا

سوالِ بوسہ تو قائمؔ کیا کر اُس سے یونہیں
کبھو تو ہوگا کوئی وقت مہربانی کا

---

۱ م: جلدی سے : غباں کی جو خام رہ گیا۔
۲ مخطوطے میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ ع ماریں ہیں ہم نگینِ سلیماں کو پہ پشت دست۔

پڑھ کے قاصد خط مرا، اُس بدزباں نے کیا کہا
کیا کہا، پھر کہہ، بتِ نامہرباں نے کیا کہا!
غیر سے ملنا تمھارا سن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہوگا کہ تم کو یک جہاں نے کیا کہا
گالیوں کی جھاڑ باندھی قصدِ سرگوشی میں رات
کیا کہا چاہے تھا میں، اُس بدگماں نے کیا کہا
سب خراجِ مصر دے کر، تھا زلیخا کو یہ سوچ
مول یوسف سے پسر کا کارواں نے کیا کہا
آہ اے مرغِ چمن، کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح
گل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر، باغباں نے کیا کہا
پھر لہو ٹپکے ہے پیارے آج کچھ باتوں کے بیچ
سچ کہو، لب سے تمھارے رنگِ پاں نے کیا کہا
قائمؔ اُس کوچے سے شب غمگیں نہ آتا تھا یوہیں
کیا کہوں تجھ سے کہ اُس کو پاسباں نے کیا کہا

---

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا — تیر سا کچھ دل سے گزر کر گیا
خاک کا سا ڈھیر سرِ رہ ہوں میں — قافلۂ عمر سفر کر گیا
خلدِ بریں اس کی ہے واں بود و باش — یاں کسی دل بیچ جو گھر کر گیا
چھپ کے ترے کوچے سے گزرا میں لیک — نالہ اک عالم کو خبر کر گیا
جوں شررِ کاغذِ آتش زدہ — شامِ غم اپنی میں سحر کر گیا
تا بفلک نالہ تو پہنچا تھا رات — میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

## ۵

پوچھ نہ، قائمؔ کی کٹی کیونکے عمر
جوں ہوا، یکچند بسر کر گیا

---

دل! یاد ہیں وہ دن کہ تجھے نادنوش تھا [1] ساغر ترے سے خونِ جگر گرمِ جوش تھا
اے ابر! اپنے گریے میں جب وقت جوش تھا جو قطرہ اشک کا تھا، سو طوفاں بہ دوش تھا
تھا عندلیب نغمہ سرائی کا جب دماغ یاں بیش خیز زمزمہ جوش و خروش تھا
کس کی نگاہِ گرم تھی گلشن پہ اے نسیم! شبنم سے برگِ گل، لبِ تبخالہ جوش تھا
کیونکر کہوں میں کن نے مرا دل کیا کباب پر ایک تیری چشم ہی سا بادہ نوش تھا
کو نوحہ گر، کہ خاک پہ میری ہو گرمِ شور تھا اک چراغِ گور، سو وہ بھی خموش تھا
واشد کے بعد یاں میں نہ دیکھا نہ کچھ سنا جوں غنچہ گو کہ پاس مرے چشم و گوش تھا
قائمؔ، تو اپنی ہستی نہ سمجھا کہاں تلک (ق) اے خانماں خراب، کوئی یہ بھی ہوش تھا
ہر دم شرار و برق سے کیا ارض و کیا سما ہر ایک تیرے منہ پہ تبسم فروش تھا

---

جلوہ چاہے ہے لے اُس بتِ ہرجائی کا نہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا
چھوڑ تنہا مجھے، یارب! انھیں کیونکر گزری غم جنھیں آٹھ پہر تھا مری تنہائی کا
عار ہے ننگ کو مجھ نام سے، سبحان اللہ! کام پہنچا ہے کہاں تک مری رسوائی کا
کوچہ گردی دلِ مجنوں نے مرے کی ایجاد مبتذل جان کے ڈھب بادیہ پیمائی کا
آہ یوں شیشۂ دل آن سے جو توڑا میرا کیا بگاڑا تھا میں اِس گنبدِ مینائی کا
کس بھروسے پہ دلا اُس کو تجا تھا تو نے اسی منہ سے تجھے دعوا تھا شکیبائی کا

---

[1] یہ شعر ل میں نہیں ہے۔

صحنِ صحرا کو سدا اشک سے رکھنا چھڑکاؤ
بس دوانہ ہوں میں قائم تری مرزائی کا

---

جی تلک آتشِ ہجراں میں سنبھالا نہ گیا — گھر میں سب کچھ تھا، پہ ہم سے تو نکالا نہ گیا
اوجھل اِس ہستی کے تنکے کے، یقینی تھا پہاڑ — یہ بپرکاہ ہی پر نظروں سے ٹالا نہ گیا
گو کہ دیتا تھا فلک مول میں دل کے دو جہاں — اِتنی قیمت پہ تو اِس مال کو ڈالا نہ گیا
رخت باندھا نہ کس اندوہ (و) خوشی نے دل سے — اک ترے غم ہی کا اِس گھر سے اٹھالا نہ گیا

کیا زرِ داغ نہ گردوں نے دیے قائم کو
اُس قلندر کا پہ اک[1] روز دوالا نہ گیا

---

ٹکڑے کب غم نے یہ جگر نہ کیا — نہ کیا نالہ ہم نے، پر نہ کیا
دل سے طوفانِ گریہ اُمڈے ہزار — ہم نے پر اک مژہ کو تر نہ کیا
خُم کے خُم پی گئے سے منصور — لیک اُس کا سا شور و شر نہ کیا
پاسے دیوارِ دوست، اک مدت — ہم بھی کاٹی، پہ نالہ سر نہ کیا
موجِ گرداب کی طرح ہم نے — گھر سے باہر کبھو سفر نہ کیا
کارِ دنیا پڑا سپہر کے ہاتھ — جب کہ ہم نے یہ دردِ سر نہ کیا
دل نہ دنیا ہی خوب تھا، پر حیف — ہم نے یہ سوچ بیشتر نہ کیا
بارہا دل گیا اِسی رہ سے — پر تقیّد میں چشم پر نہ کیا

دوش کیا دیجے چور کو قائم
بند گھر کا میں آپ در نہ کیا

---

[1] م، پہ یکروز
[2] مخطوطے میں "دوست" ہے۔

عہدے سے تیرے ہم کو بر آیا نہ جائے گا
یہ ناز ہے، تو ہم سے اٹھایا نہ جائے گا

ٹوٹا جو کعبہ، کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

آتش تو دی تھی خانۂ دل کے تئیں میں آپ
پر کیا خبر تھی یہ کہ بجھایا نہ جائے گا

ہوتے ترے محال ہے ہم درمیاں نہ ہوں
جب تک وجودِ شخص ہے سایا نہ جائے گا

مجرم ہوں وہ کہ ایک فقط روزِ بازپرس
نامہ مرے عمل کا دکھایا نہ جائے گا

ہے خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سب خراب
غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جائے گا

قائمؔ، خدا بھی ہونے کو جو جانتے ہیں ننگ
بندہ تو اُن کے پاس کہایا نہ جائے گا

---

ڈر نالے سے، جو ہوئے تریں جانِ خستہ کا
ہے بے طرح یہ تیر کمانِ شکستہ کا

جوں لالہ، داغِ سینہ سے کیا کام تھا ہمیں
یارب، بُرا ہو اِس دلِ درخوں نشستہ کا

بند ہوا تری نگہ کا جیسے کیا یہ کامِ دل
پرواز گم ہے مرغِ پر و بال بستہ کا

وضعِ شباب عالمِ پیری میں رکھ نہ دوست
کب رو ہے پھر کماں کی طرف تیرِ جستہ کا

قائمؔ، اُگا ہے نخل مرا واں کہ جس جگہ
سر ہے ہمیشہ پائے تبر، شاخِ رستہ کا

---

میں خوب اہلِ جہاں دیکھے اور جہاں دیکھا
پر آشنا کوئی دیکھا نہ مہرباں دیکھا

ہمیشہ منع تو کرتا تھا باغ سے ہم کو
کچھ حال اب گل و گلشن کا باغباں دیکھا

طلب کمال کی کوئی نہ کیجیو زنہار
کہ میں یہ کر کے فضولی، بہت زیاں دیکھا

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے
کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا

شنیدہ کو دیکھے پہ ہم کس طرح سے دیں ترجیح
خدا تو ہم نے سنا ہے، تمھیں بتاں دیکھا

برنگِ غنچہ بہار اِس چمن کی سنتے تھے — پہ[1] جوں ہی آنکھ کھلی، موسمِ خزاں دیکھا
نہ کہتے تھے تجھے قائم کہ دل کسی کو نہ دے
مزہ کچھ اِس کا بھلا تو نے اے میاں دیکھا

---

ہے مختصر تو یہ قصہ مری تباہی کا — کہ تھا جو کچھ، سو ہوا قوتِ مرغ و ماہی کا
غرور مجھ کو نہیں شیخ، بے گناہی کا — اُمیدوار ہوں میں رحمتِ الٰہی کا
نہ[2] کر غرور تو منعم، کہ دم میں مثلِ حباب — بہ باد جاتے میں دیکھا ہے چترِ شاہی کا
گناہ جس کی ازل سے ہو وارث اے زاہد — وہ مدعی ہو بھلا کیوں کے بے گناہی کا
بجا ہے خانہ نشینی یہ چشم کی اُس کی — نہیں زمانے میں خواہاں کوئی سپاہی کا
ہے آپ سے بھی توقع غلط، کہ ناخنِ فلس — کبھی نہ کھینچتے دیکھا میں خارِ ماہی کا
کہاں ہے دیدۂ گریاں کہ اب بقیۂ عمر — کریں علاج ہم اس اپنی روسیاہی کا
فلک، جو دے تو خدائی[3]، تو لے نہ اب قائم
وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

---

میں نہ وہ ہوں کہ تنک غصے میں ٹل جاؤں گا — ہنس کے تم بات کرو گے، میں بہل جاؤں گا
ہم نشیں! کیجیو تقریب تو شب باشی کی — آج کر نشّے کا حیلہ میں مچل جاؤں گا
دل، مرے ضعف پہ کیا رحم تو کھاتا ہے کہ میں — جان سے اب کی بچا ہوں تو سنبھل جاؤں گا

---

[1] یہ مطلع ل، میں نہیں ہے۔

[2] م، نہ کر غرور تو منعم کہ ایک گردش میں — فقیر کا سا پیالہ ہے تاجِ شاہی کا

[3] م، تو خدائی بھی لے نہ اب قائم

پھر اس کوچے کی کرتا ہوں کہ جبریل جہاں | جا کے بولا کہ بس اب آگے میں جل جاؤں گا
تنگ ہوں میں بھی اب اس جینے سے اے [illegible] | جا نکل جا جو تو کہتا ہے نکل جاؤں گا
شوخ [illegible] ہے پروا مجھے کیا اے واعظ | جب کہ ہمراہ لیے دل سا خلل جاؤں گا

شوخی سے کیجیو جوں ہند میں طوطی قائم
آگے سودا کے میں لے کر یہ غزل جاؤں گا

---

[illegible] تو جو کوچے سے ترے جا اٹھیے گا | کچھ سمجھ کر ہی پھیر آئیے گا
دل کہاں تک اٹھائے جور ترے | تجھ سے اب دل ہی کو اٹھائیے گا
کس غلط سا تھ موج کے لگ لے | بہتے بہتے کہیں تو جائیے گا
جرأت [illegible] یاں رہ کر | کب تلک دردِ سر اٹھائیے گا
[illegible] ہے اس سر سے اس عالم کے | جا کوئی جھونپڑا بنائیے گا
[illegible] اس کے ہاتھ [illegible] اس کی [illegible] | کس کے آگے یہ سر جھکائیے گا
[illegible] یاں سے جب قائم | یہی ٹھہری کہ مر ہی جائیے گا
[illegible] دن جو زیست ہے اس پر | کس کی منت عبث اٹھائیے گا
بند کر بیٹھیے در جانانہ | ایسی فرصت کو پھر نہ پائیے گا
[illegible] پینے کو چند روز کے اشک | خونِ دل جب تلک ہے کھائیے گا

---

کہاں میں، کیا اعتبار میرا | خواری بس افتخار میرا

---

[illegible] نسخے میں ردیف "جائیگا" لکھی ہوئی ہے۔ غزل میں بعض اشعار میں "جائیے گا" کا محل ہے اور بعض جگہ "جائیے گا" کا۔

قائمؔ اپنے میں ضعف اس حد کو — طور یہ چل بچل احبا کا
سنیے کس کا سخن کہ دل سے مٹے
داغ مرزا رفیع سوداؔ کا

---

میں کیا کہوں کہ جو کچھ مجھ پہ زیر دام ہوا — وہی یہ سمجھے جو تڑپھا نہ اور تمام ہوا
سرائے دہر عجب دل فریب ہے کہ جہاں — خبر ہی کوچ کی ہووے جو یک مقام ہوا
بنا تھی عیشِ جہاں کی تمام غفلت پر — کھلی جو آنکھ تو گویا کہ احتلام ہوا
یہ چاکِ جیب ابھی سینا عبث ہے اگر ناصح — جگر کے زخم کا تجھ سے نہ التیام ہوا
جہاں میں شہرہ تھی مجنوں کی ذلتیں قائمؔ
سو بارے عہد میں تیرے وہ نیک نام ہوا

---

شب جو دل بے قرار تھا کیا تھا — کسی کا انتظار تھا، کیا تھا
چشم در پر تھی صبح تک، شاید — کچھ کسی سے قرار تھا کیا تھا
مدّتِ عمر[۱]، جس کا نام ہے آہ — برق تھی یا شرار تھا کیا تھا
نہ دیا دل جو پھر تو دے کے، میں کچھ — ایسا بے اعتبار تھا کیا تھا
دیکھ مجھ کو، جو بزم سے تو اٹھا — کچھ تجھے مجھ سے عار تھا کیا تھا
پھر گئی وہ نگہ جو یوں محرم — سیل تھی یا کٹار تھا کیا تھا
صاف[۲] کہہ دے کہ شب وہ تیرے پاس — کون سا جانگزار تھا کیا تھا
رات قائمؔ تو اس مزاج پہ واں — سخت بے اختیار تھا کیا تھا

---

۱؎ م، عرصۂ عمر — ۲؎ یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

بے دماغی سے نہ اس تک دلِ رنجور گیا     مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا
آہ، پہلو میں سے میرے دلِ رنجور گیا     تا کجا ضبطِ نفس، کیجیے کہ مقدور گیا
دُکھ کے نیشوں سے مشبّک ہے مرا دل اے عشق     چھیڑنے کو تو عبث خانۂ زنبور گیا
جس جگر سے کہ یہ دل نوکِ مژہ تک پہنچا     کب سرِ دار پہ اس دھوم سے منصور گیا
صرصری[1] جس کو خبر تیری صبا سے پہنچی     گل کے مانند وہ اس بات سے مسرور گیا
فیضِ صحبت سے جو یاں دل کے کبھو کا نہ ہوا     خلوتِ داغ میں کب مرہمِ کافور گیا
رہ گئی بانگِ درا آنے سے اے قیس ہنوز     ناقۂ محملِ لیلیٰ کہیں اب دور گیا
کان تک یار کے قائمؔ مرے اس عالم سے (ق) رفتہ رفتہ جو کہ جانے کا مذکور گیا

سُن کے اتنا تو کہا، حیف کہ اب دنیا سے
ناز برداری کا معشوق کی دستور گیا

---

جو کوہ کن، تجھے زور اپنا آزمانا تھا     عوض پہاڑ کے شیریں سے دل اٹھانا تھا
کوئی دن آگے بھی زاہد عجب زمانا تھا     ہر اک محلے کی مسجد، شراب خانا تھا
اندھیری رات، یہ کوچہ، میں مست، یار حریف     غلط کیا میں، مجھے اس طرف نہ آنا تھا
بہ رنگِ طائرِ بو، ہم اسیر اے صیاد     وہ ہیں کہ جن کا گلوں بیچ آشیانا تھا
معاملہ ہے یہ دل کا، اسے کہے گا وہ کیا     پیام بر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا
شکن جو زلف کی اپنی بنائی تم تو کیا     دلِ شکستہ کسی کا کبھو بنانا تھا
کہاں یہ گل، کدھر اے ہم صفیر ہم، یک چند     شریک تم میں ہمارا ابھی آب و دانا تھا
یہ سچ، کہ جھوٹھ ہے دعواے دوستی، لیکن     کبھی ہمیں بھی تو اک بار آزمانا تھا

---

[1] م اور ل، دونوں میں یہی املا ہے۔

گئی بہار نہ اب کے تو بخت میں اپنے    کوئی دم اور بھی دنیا میں باو کھانا تھا
کہو کہ گورِ غریباں میں رکھیں قائم کو
کہ اُس کا جیتے بھی اکثر وہی ٹھکانا تھا

---

جس چشم کو وہ میرا خوش چشم نظر آیا    نرگس کا اُسے جلوہ اک پشم نظر آیا
۱؎ بدگوہری گردوں کی کیا تجھ سے بیاں کیجے    سمجھا تو زمرّد تھا، پر پشم نظر آیا
قائم ترے کوچے سے آزردہ نہ کیوں جاوے
وہ لطف کا طالب تھا، یاں خشم نظر آیا

---

مرے نزدیک، دل سے دردِ پہلو دور بہتر تھا
عوض اِس چشم کے، ہوتا اگر ناسور، بہتر تھا
میں دیکھا، خاک تھا ۲؎ جوں کرم خوردہ چوب باطن میں
بہ ظاہر گرچہ نظروں میں ترا رنجور، بہتر تھا
گیا وہ دار پر، اور نوک سے مژگاں کی یہ گزرا
خدا ہی جانے اب، دل خوب، یا منصور بہتر تھا
نہیں کہتا میں دل، خوباں سے مطلق ترک کر صحبت
پر اِس فرقے سے کم ملتا تو تا مقدور بہتر تھا
گرایا شیخ تیں چاہِ ضلالت میں مریدوں کو
تری اِس رہ بری سے تو عصائے کور بہتر تھا

---

۱؎ م، بدگوہری گردوں کیا تجھ سے .....    ۲؎ م، خاک تھا باطن میں جوں چوب کرم خوردہ

جلایا تو وہ تیں موسیٰ عبث برقِ تجلّی سے
اس آتش میں تو جل بجھنے کو دل کا طور بہتر تھا
[1]ہر اک سے کہہ کے دل کا راز تو رسوا ہوا قائمؔ
بھلا اسے بے خبر، یہ بھی کوئی مذکور بہتر تھا

---

کب یہ کہتا ہوں کہ تیرا میں گنہ گار نہ تھا
لیکن اتنی تو عقوبت کے سزاوار نہ تھا
دل سے شرمندگی، اور جور ترا، طعنِ رقیب
عشق نے سہج کیا مجھ پہ جو ہموار نہ تھا
آہ اے عشق! کیا ہوگا مرا راز تو فاش
جز ترے اور کوئی محرمِ اسرار نہ تھا
سر تہِ بال کٹی عمر مری بلبل کو
قابلِ سیر مگر یہ گل و گلزار نہ تھا
شورِ احباب لے آیا ہے ہمیں کھینچ کے یاں
ورنہ کچھ آپ کو گلشن سے سروکار نہ تھا
چاک کر خط کو مرے، پھیر جو بھیجا تو نے
تیرے کوچے میں مگر رخنۂ دیوار نہ تھا
لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائمؔ
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا!

---

محتسب سے صلاح کیجیے گا
مے کو چندے مباح کیجیے گا
نامہ بر مل رہا ہے غیر کے ساتھ
خط میں کچھ اصطلاح کیجیے گا
دخترِ رز کو تو دی طلاق، پر اب
مغ بچوں سے نکاح کیجیے گا
صبح کا کام شام پر تو رکھا (ق) شام بولا صباح کیجیے گا
گر یہی ڈول ہے[2]، تو کب قائمؔ
ساز و برگِ فلاح کیجیے گا

---

[1] م، ہر اک سے رازِ دل کہہ کر تو یاں رسوا ہوا قائمؔ
[2] م، ہیں

ہے جو کوئی کہ آشنا دل کا — وہی سمجھے ہے مرتبا دل کا
شیشۂ دل کو دوں میں کیوں کے تجھے — ہے یہ پیارے معاملا دل کا
سیلِ آتش میں غرق ہوں دو جہاں — جائے گر پھوٹ آبلا دل کا
روتے کڑھتے گئی اک عمر پہ آہ — کچھ نہ سمجھا میں مدعا دل کا
اے نسیم اس گلی سے آئی ہے تو — تیں بھی احوال کچھ سنا دل کا
دل ہی جانے ہے کیا کہوں میں اسے — مجھ سے جو اختلاط تھا دل کا
پیٹھ پیچھے گلہ تو بد ہے ولے — منہ دکھاوے نہ پھر خدا دل کا

اور تو شعر ہیں ہی، پر قائم
خوب کہتا ہے مرثیا دل کا

---

عوض طرب کے گذشتوں کی ہم نے غم کھینچا — شراب اوروں نے پی، اور خمار ہم کھینچا
طرازِ کلکِ قضا اور بھی تو ہیں مشہور — پہ تجھ سا صفحۂ ہستی پہ نقش کم کھینچا
طریقِ عشق یہ ہے کہ بوالہوس سے جاتے ہیں سر — بھلا ہوا کہ تو اس راہ سے قدم کھینچا
خلش تھی مدِ نظر ہم سے حرف گیروں کو — سو ہم نے ہاتھ ہی لکھنے سے یک قلم کھینچا
کہاں ہے مرگ کہ جوں شمع دے مجھے تسکین — بہت میں داغ محبت سے یاں الم کھینچا

[1] یہ خطِ ہند ہے قائم گویا مرا دیواں
زبس کہ لکھ کے میں ہر بیت پر قلم کھینچا

---

[1] م، میں مقطع اس طرح ہے۔ ـــ

مری بیاض سے ہے قائم مثالِ خطِ ہند — زبس میں لکھ کے ہر اک بیت پر قلم کھینچا

چھوڑ ناوا سے ذقن، زلفِ پریشاں میں پھنسا
مثلِ یوسف، میں نکل چاہ سے زنداں میں پھنسا

سیلِ اشک آج رکی آنکھ سے گرتے ہی مگر
پھر کوئی لختِ جگر دیدۂ گریاں میں پھنسا

کچھ بھی وقفہ ہو تو گلشن سے لے آئیں صیاد
رہ گیا ہے دلِ غم کش گل و ریحاں میں پھنسا

کھینچ دامن رکھیں ہم یار کو کس طرح کہ ہاتھ
ایک تو دل پہ ہے اور ایک گریباں میں پھنسا

اے کہ چاہے ہے تو دیوان کو قائم کے، تو دیکھ
کہیں ہو گا کسی خمار کی دوکاں میں پھنسا

---

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ، چپ بھی رہا نہیں جاتا
روبرو میرے، غیر سے تو ملے — یہ ستم تو سہا نہیں جاتا
جا ہے ماتم کو نت مرے دل میں — اس نگر سے رہا نہیں جاتا
شدتِ گریہ سے میں خوں میں کب — سر سے پا تک نہا نہیں جاتا
بزم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر، رہا نہیں جاتا
مانعِ گریہ کس کی خو ہے کہ آج — آنسوؤں سے بہا نہیں جاتا

گرچہ قائمؔ، اسیرِ دام ہوں، لیک
مجھ سے یہ چہچہا نہیں جاتا

---

میں اس سلیقے سے دل کا مزہ تمام لیا — کہ مو بہ موئے بدن سے سناں کا کام لیا

تجھی[1] سے شیشۂ دل توڑنے محتسب، یاں تو — بھر آئی چشم، اگر ہاتھ میں میں جام لیا
ہو ترکِ ساغرِ مے اِس بہار میں کیوں کر — کہ شاخِ گل نے ہر اک سو چمن میں جام لیا
کتب[2] آئینے کو یہ تسخیر آئے ہیں پیارے — کسو کا دل ہے وہ جن نے یہ انتقام لیا
بتاں کی نظروں سے نزدیک تھا کہ اتریں ہم — گرے تھے دور سے لیکن خدا نے تھام لیا
ہزار جان اگر ہوں تو کیجیے تسلیم — یہ[3] آیں ادا کہ تو پیارے مرا سلام لیا
پیام پردے میں کہنا تھا واں مرا قاصد — ستم کیا کہ تو پہلے ہی اُس سے نام لیا
ازل[4] میں تھی ہمیں بلبل کے ساتھ شرکتِ بخت — چمن قبول کیا اُن نے، ہم نے دام لیا

نباہ کوے توکل سے ایک کا ہے محال
چہ جا کہ ساتھ تو قائم اک اژدہام[5] لیا

---

یہ جامہ سیرِ گلشن میں کبھو اے خوش دہن پھٹتا
کلی کا دل تڑکتا اور گلوں کا پیرہن پھٹتا
وہ آہیں ضبط کی ہیں عشق میں تیرے ہم اے ظالم
کہ جن کے نام کی صولت سے جوں بادل گگن پھٹتا
اذیت ایک دم اور تا قیامت خوابِ شیریں ہے
ہمارا سر تری سی طرح کاش اے کوہ کن پھٹتا
سدا صبحِ طرب تھی بے کسوں کو شامِ غربت میں
دل اِن کا سمت سے تیری جو اے حب الوطن پھٹتا

---

[1] یہ شعر ل میں نہیں ہے
[2] م، تو آپ دیکھ یہ کام آئینے کا ہے پیارے۔
[3] ح میں "یہ ادن" ہے۔
[4] م، شریکِ قسمتِ ازل کے تھے دل ہم اور بلبل
[5] ح میں یہی املا ہے۔

نہ لاگا زخم تو ایسا کبھو شمشیر سے تیری
کہ جس کی حسرتوں سے سینۂ زخمِ کہن پھٹتا
چھری تلوار کرتا ہے تو ٹک چولی مسکنے میں
ستم ہوتا جو کہیں جامہ ترا اے گل بدن پھٹتا
یقیں ہے یہ کہ قائمؔ، گل ہے اُس گلرو کا دیوانہ
وگرنہ جیب اس کا کیونکے بے دیوانہ پن پھٹتا

---

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو، لیتا ہو اگر نام کسی کا
اب تک بھی میں جیتا ہوں، جو آتا ہے تجھے، آ — پھر فائدہ، جب ہو ہی چکے کام کسی کا
آغاز ہی میں خط کے، یہ شورش ہے جنوں کی — کیا جانیے کیا ہوئے گا انجام کسی کا
گوشومیِ طالع سے، فلک، قید ہو کوئی — پر زلف کی پیچش تو نہ ہو دام کسی کا
خوباں کے طرف دیکھنے کا بندہ ہوں میں قائمؔ
ملتے ہیں کہیں، نام ہے بدنام کسی کا

---

چرخِ مینائی سے کیا مر کے کوئی چھوٹے گا — مے ہے اس شیشے میں تا شیشہ[۱] نہ یہ پھوٹے گا
جن نے پاؤں کو ترے ہاتھ لگایا اک بار — تا جیے گا، وہ مری طرح سے سر کوٹے گا
نالہ دیتا نہیں کل جی کو ابھی سے یاں تو — آج کیا جانیے کیا دل پہ غضب ٹوٹے گا
دل مرا، تم کو تو، لٹکا ہے دسہرے کی تباں — فتح ہے سال بھر اُس کی، جو اسے لوٹے گا
عشق تو ہم سے چھٹا، لیک نہ جانے قائمؔ
دیکھ لینے کا جو لپکا ہے، یہ کب چھوٹے گا

---

لہ م، شیشہ نہ یہ ٹوٹے گا۔

تجھی[1] سے شیشۂ دل توڑے محتسب، یاں تو | بھر آئی چشم، اگر ہاتھ میں میں جام لیا
ہو ترکِ ساغرِ مے اِس بہار میں کیوں کر | کہ شاخِ گل نے ہر اک سو چمن میں جام لیا
کب[2] آئنے کو یہ تسخیر آئے ہیں پیارے | کسو کا دل ہے وہ، جن نے یہ انتقام لیا
بتاں کی نظروں سے نزدیک تھا کہ اُتریں ہم | گرے تھے دور سے لیکن خدا نے تھام لیا
ہزار جان اگر ہوں تو کیجیے تسلیم | یہ آئیں[3] ادا کہ تو پیارے مرا سلام لیا
پیام پڑھنے میں کہنا تھا واں مرا قاصد | ستم کیا کہ تو پہلے ہی اُس سے نام لیا
ازل[4] میں تھی ہمیں بلبل کے ساتھ شرکتِ بخت | چمن قبول کیا اُن نے، ہم نے دام لیا

نباہ کوے توکّل سے ایک کا ہے محال
چہ جا، کہ ساتھ تو قائم اک ازدہام[5] لیا

---

یہ جامہ سیرِ گلشن میں کبھو اے خوش دہن پھٹتا
کلی کا دل تڑکتا اور گُلوں کا پیرہن پھٹتا

وہ آہیں ضبط کی ہیں عشق میں تیرے کہ ہم اے ظالم
کہ جن کے نام کی صولت سے جوں بادل گگن پھٹتا

اذیت ایک دم اور تا قیامت خوابِ شیریں ہے
ہمارا سر تری سی طرح کاش اے کوہ کن پھٹتا

سدا صبحِ طرب تھی بے کسوں کو شامِ غربت میں
دل اِن کا سمت سے تیری جو اے حب الوطن پھٹتا

---

[1] یہ شعر ل میں نہیں ہے
[2] م، تو آپ دیکھ یہ کام آئنے کا ہے پیارے۔
[3] مخ میں "بہ ادن" ہے۔
[4] م، شریکِ قسمتِ ازل کے تھے دل ہم اور بلبل
[5] مخ میں یہی املا ہے۔

نہ لاگا زخم تو ایسا کبھو شمشیر سے تیری
کہ جس کی حسرتوں سے سینۂ زخمِ کہن پھٹتا
چھری تلوار کرتا ہے تو ٹک چولی مسکنے میں
ستم ہوتا جو کہیں جامہ ترا اے گل بدن پھٹتا
یقیں ہے یہ کہ قائمؔ، گُل ہے اُس گلرو کا دیوانہ
وگرنہ جیب اس کا کیونکے بے دیوانہ پن پھٹتا

---

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو، لیتا ہو اگر نام کسی کا
اب تک بھی میں جیتا ہوں، جو آنا ہے تجھے، آ — پھر فائدہ، جب ہو ہی چکے کام کسی کا
آغاز ہی میں خط کے، یہ شورش ہے جنوں کی — کیا جانیے کیا ہوئے گا انجام کسی کا
گو شومیِ طالع سے، فلک، قید ہو کوئی — پر زلف کی پیچش تو نہ ہو دام کسی کا
خوباں کے طرف رکھنے کا بندہ ہوں میں قائمؔ
ملتے ہیں کہیں، نام ہے بدنام کسی کا

---

یہ زنخ یہ نائی سے کیا مر کے کوئی چھوٹے گا — مے ہے اس شیشے میں تا شیشہ نہ یہ پھوٹے گا[۱]
جن نے پاؤں کو ترے ہاتھ لگایا اک بار — تا جیے گا، وہ مری طرح سے سر کوٹے گا
نالہ دیتا نہیں کل جی کو ابھی سے یاں تو — آج کیا جانیے کیا دل پہ غضب ٹوٹے گا
دل مرا، تم کو تو، لٹکا ہے دسہرے کی تباں — فتح ہے سال بھر اُس کی، جو اسے لوٹے گا
عشق تو ہم سے چھٹا، لیک نہ جانے قائمؔ
دیکھ پینے کا جو لپکا ہے، یہ کب چھوٹے گا

---

[۱] م، شیشہ نہ یہ ٹوٹے گا۔

دل، رات کس کی یاد تھی، کیسا ملال تھا　　صدقے میں، کچھ تو بول تو، کیا تجھ پہ حال تھا
چھوٹا ترا مریض اگر مر گیا کہ شوخ　　جو دم تھا زندگی کا سو اُس پر وبال تھا
ناخن ترے کی منہدی سے تنہا نہیں ہیں داغ　　چندے شفق سے نعل در آتش ہلال تھا
اِس سوچ سے کھلی ہے حقیقت کہ ایک عمر　　کُھنی کی فرج و شیخ کی داڑھی[1] کا بال تھا
تو چشمِ فہم، تا کہ نظر آئے یہ کہ یاں　　دیکھا جو کچھ سو خواب، جو سمجھا خیال تھا
جھگڑا امر کیا ہے نہ تیں صاف، ورنہ شوخ　　ذرہ زباں پہ تیغ کی یہ انفصال تھا

قائمؔ میں ریختے کو دیا خلعتِ قبول
ورنہ یہ پیشِ اہلِ ہنر کیا کمال تھا

---

تمام ریم و لہو دل کے داغ سے نکلا　　یہ دُرد و صاف مرے اِس ایاغ سے نکلا
گیا نہ یاں سے وہ سودائے زلف تا دمِ مرگ　　مقیم دل میں ہوا گر دماغ سے نکلا
تری اسیری میں، غم ہے اگر، تو اتنا ہے　　کہ پہلے کیوں نہیں قیدِ فراغ سے نکلا
یہ گُل کے چھیڑتے، آہ و فغاں کی بلبل نے　　کہ اپنی جان لے جوں توں میں باغ سے نکلا
نہ جانے کس کا دلِ روشن آہ ہم سے بجھا　　کہ پھیر شعلہ نہ اپنے چراغ سے نکلا
کسو نے کھو کے کبھی پایا ہے اس طرح پھر دل　　یہ نقدِ گم شدہ میرے سراغ سے نکلا

تو اپنے داغ سے قائمؔ نہ ہو ملول کہ یاں
بہت ہوا ہے کہ سیمرغ، زاغ سے نکلا

---

تا اِس طرف سے راہ ہے[2] اُس شہسوار کا　　ہے عرش پر دماغ ہمارے غبار کا

---

[1] ل' میں اس کا املا 'ڈاڑہی' ہے۔

[2] مخطوطے میں "راہ ہے" پر قلم لگا کر حاشیے میں "ہے گذر" درج ہے۔

ساقی بھڑا دے غم ہی مرے منہ سے تو کہ آہ
ظالم، نپٹ قلیل ہے عرصہ بہار کا

جب تک نگہ سے کام چلے، بھویں کو مت چڑھا
گاڑھا ہے زخم، تیغ سے ظالم کٹار کا

کیوں مضطرب رکھا تو مجھے اے فلک سدا
ظالم، نہ تھا میں دل تو کسی بیقرار کا

وعدہ[1] اُس کے ساتھ، نہ پیغام، کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

اس زلف و رو سے کون سی نسبت ہمیں تھی، لیک
یہ بھی اک اتفاق ہے لیل و نہار کا

قائمؔ، جو کچھ کہ ہو گی، سمجھ لیجو بعدِ مرگ
اب جیتے جی تو دید اُڑا اس دیار کا

---

وہ حال سے مرے آشنا نہ بے خبر ہوتا
اگر مرا اثرِ آہ نامہ بر ہوتا

نہ دیکھتا میں تمہارا یہ حال اے آنکھو!
جو ایسے وقت میں دل سا کوئی جگر ہوتا

کبھو تو غیر سے رنجش تھیں، کبھو اخلاص
طرف جو اس کی نہ کرتا، تو میں کدھر ہوتا

الٰہی، واقعی اتنا ہی بد ہے فسق و فجور
پر اس مزے کو سمجھتا جو تو بشر ہوتا

بھلا[2] ہوا کہ نہ کی میں صداعِ غم کی دوا
کسے دماغ تھا اک اور دردِ سر ہوتا

شبِ فراق ہے[3] چشم، اِس قدر تو لازم تھا
کہ جوشِ گریہ سے دامانِ عرش تر ہوتا

قدِ خمیدہ سے کر شرم، تا کجا قائمؔ
پھرے گا حلقہ صفت یاں تو در بدر ہوتا

---

ہم بھی ہر طرح تری دوری میں دل شاد کیا
ہچکی گر آئی تو سمجھے ہیں کہ تم یاد کیا

کہتے ہیں یاد میں تیری وہ ہوا جاتا ہے
بھول کر بھی نہ کبھو تو نے جسے یاد کیا

مبتذل تھا وہ تری چشم سے پیارے مضموں
جو ستم چرخِ جفا پیشہ نے ایجاد کیا

---

۱ م، نے ۔ ۲ م، بھلا ہوا کہ میں فارغ ہوں دین و مذہب سے۔ ۳ م، میں

وہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہے آسودہ — ماتمِ قیس کیا یا غمِ فرہاد کیا
جس کسی نے یہ کہا تجھ سے غلط، جھوٹ، خلاف — کس کے آگے میں ترا شکوۂ بیداد کیا
چھوٹ کر دام سے ہم اگرچہ ہے گلشن میں — پہ تری قید کو صیاد بہت یاد کیا
ڈھونڈھے[1] جاکر کے کوئی یاں تجھے کیدھر قائم
تو نے کیا جانیے کس دشت کو آباد کیا

---

میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا — لے دل میں اپنے حسرتِ سرو و سمن گیا
شیریں، تو ساتھ خسرو کے، جوں چاہے کر معاش — پتھر تھا تیری چھاتی پہ، سو کوہ کن گیا
روؤں گا زور، سایۂ دیوار بیٹھ کر — جس دن تری گلی میں کہیں داد بن گیا
اے تابِ ضبطِ نالہ، کہیں منصفی بھی ہے — کب تک رکوں میں، آہ[2] کلیجا تو چھن گیا
تو دے تو گُرسنگوں کے ہر اک سمت لگ چلے — لیکن یہ اب تلک نہ ترا بانکپن گیا
ظالم! تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے پھر آپ ہی من گیا
کیا خضر و کیا مسیح، ہے تیری گلی وہ جا — جو واں گیا، سو باندھ کے سر سے کفن گیا
اے گردشِ زمانہ: تری کج روی کے بیچ (ق) یکسر نواحِ ہند سے شعر و سخن گیا
سودا تو اپنے حال میں مدت سے مست ہے
قائم رہا تھا ایک، سو اپنے وطن گیا

---

میں عشق میں بتاں کے دل و دیں تو کھو چکا — ناصح، تو کیوں بکے ہے، جو ہونا تھا ہو چکا
مرغانِ یاس کو ہو نوید اے فلک کہ پھر — تخمِ اُمید، مزرعِ دل میں میں بو چکا

---

[1] م، کس جگہ ڈھونڈیے قائم تجھے اے خانہ خراب ÷ جانیے کون سے جنگل کو تو آباد کیا
ل، میں پہلے مقطع اسی طرح لکھا گیا تھا، پھر اس کو کاٹ کر، درج متن صورت اختیار کی گئی۔
[2] م، اور

یاں ابر یار ہنستے ہیں اس گریہ دوست پر — یک جا ٹھہر کے جو دو سہ دریا نہ رو چکا
طوفاں ہو، جو گریہ ابھی سے تھمے، کہ آہ — کچھ نوح تو نہیں میں کہ عالم ڈبو چکا
آغوش میں ہوں بالشِ مخمل کو کیوں تکے ہیں — یہ وہ بغل ہے جس میں تو اک عمر سو چکا
طرّے پہ گل کے ریجھے ہو کیا تم، ادھر تو آؤ — یاں لختِ دل میں تارِ مژہ میں پرو چکا

قائم ضرور کیا ہے اب اُس جنگ جو سے صلح
مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

---

ہم ہیں جنھوں نے نامِ چمن بو نہیں کیا — آئی صبا جدھر سے، اُدھر رو نہیں کیا
ہم ہیں ہوائے وصل میں اُس گل کی، دربدر — جس کا صبا نے طوفِ سرِ کو نہیں کیا
وہ خوب رو ہے کون سا جگ میں فرشتہ وش — دو روز مل کے ہم جسے بدخو نہیں کیا
اے نزع، پھر قریب ہے شامِ شبِ فراق — یہ مجہلہ، تو اب تئیں یکسو نہیں کیا

قائم کو اس طرح سے تو دیتا ہے گالیاں
جس کو کسی نے آج تلک تو نہیں کیا

---

نہیں بندِ قبا میں تن ہمارا — ہے عریانی ہی پیراہن ہمارا
رکھیں اپنے تئیں ہم کس طرح دوست — ہو تجھ سا شخص جب دشمن ہمارا
ہیں[1] یہ کاہیدہ ہم غم سے کہ جوں شمع — ہے ایک اب جیب اور دامن ہمارا
نظر میں کعبہ کیا ٹھہرے، کہ یاں دیر — رہا ہے مدتوں مسکن ہمارا
چمن میں گر ہے تو بلبل، تو من بعد — ہیں ہم اور گوشۂ گلخن ہمارا

---

[1] م، ہیں کاہیدہ زبس غم سے ہی جوں شمع — رہی جیب اور وہی دامن ہمارا

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اوّل     وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا
بہارِ داغ تھی جب دل پہ قائم
عجب سرسبز تھا گلشن ہمارا

---

نہ لیں تجھے نام ہم اس سے ہی آشنائی کا     یہ سوجھے تھا ہمیں دن تیری بیوفائی کا
ہمیں ہیں یاں وہ گرفتارِ دامِ غم، کہ سدا     جلے ہے جن کی اسیری پہ دل رہائی کا
نہ جوں حباب ہو طالب نمود کا کہ نداں     مآلِ کار خرابی ہے، خود نمائی کا
کہاں ہے دیر، کہ پوچھوں مغاں سے چارۂ کار     ہے پھر گھمنڈ طبیعت میں پارسائی کا
نہ پہنچا کان تک اس جنگ جو کے حال مرا     خدا بھلا کرے نالے کی نارسائی کا
اک آبِ ناں سے میں حاضر ہوں سب سے آئنہ وار     اگرچہ ڈول ہے مدت سے یاں صفائی کا
بتاں، نہ سمجھو کہ قائم ہے دیر کا پابند
تماشا بین ہے یہ رند اک خدائی کا

---

قدم تو کس کا ترے کو میں پھر گیا ہوگا     گیا بھی ہوگا کسی کا، تو سر گیا ہوگا
تو دل کو ڈھونڈھے ہے سینے میں اب تلک اے غم     کبھی کا خون ہو آنکھوں سے گر گیا ہوگا
نکلتے زلف کے کوچے سے دل میں دیکھا تھا     غبارِ خط میں کہیں آ کے گھر گیا ہوگا
وہ منڈھ چڑھے ہیں محبت کے اور ہی فرہاد     ترا بھی سر کہیں تیشے سے چر گیا ہوگا
گلی سے اس کی جو قائم کو لائے ہم، تو کیا
یہ دل پہ نقش ہے، اب تک وہ پھر گیا ہوگا

---

جز مرے کس کے تو یاں پارِ جگر سے گزرا     بس بس اے نالہ ترے میں اس اثر سے گزرا

اب تلک ڈھونڈھے ہی سینے میں تو دل کو محرم!
ہو کے کب کا وہ لہو، دیدۂ تر سے گزرا

زخم یکساں ہے دل و جاں میں نگہ کا تیری
کچھ نہ سمجھا میں کہ یہ تیر کدھر سے گزرا

موجِ دریا سے مماثل ہے جہاں کا احوال
پھر نہ دیکھا میں اسے یاں جو نظر سے گزرا

بھیج آئے کوچے کو اُس کے، میں نپٹ نادم ہوں
قاصد آوے کہیں یا رب، میں خبر سے گزرا

مثلِ پروانہ، نثار اُس کے قدم پر ہو جے
طرح سے شمع کے، مردانہ جو سر سے گزرا

صورتِ آئینہ ساں، محو ترے جلوے کا
رہ گیا در پسِ دیوار، جو در سے گزرا

فرق مو سے نہ ہوا موے کمر کا ظاہر
کھل کے جوڑا جو ترے مو کا کمر سے گزرا

داغِ دل نے جو دمِ سرو سے دیکھا قائم
شمع کے جی پہ وہ کب بادِ سحر سے گزرا

---

بے فصلِ گل، نہ روے گریباں دیکھنا
جو کچھ کہے بہار، سو ٹک مان دیکھنا

یک[۱] سر ہے اور ہزار خیالاتِ دور دست
عاشق کا اپنے ٹک سر و سامان دیکھنا

پل مارتے کرے ہے اشاروں سے متّہم
ٹک اُس ستم ظریف کا بہتان دیکھنا

بہتر ہے کوے یار سے رخصت ہو اب تو دل
باقی جو زندگی ہے تو پھر آن دیکھنا

شاید کہ دل مرا بھی کہیں ہووے اے نسیم
کوچے کی اس کے خاک تو ٹک چھان دیکھنا

نلیچے ہے شیخ و بد میں کس تاو بھاو سے
اس ہیزِ ریش دار کی ٹک شان دیکھنا

قائم قدم سنبھال کے رکھ کوے عشق میں
یہ راہ بے طرح ہے مری جان، دیکھنا

---

۱ مخطوطے میں اصلاً یہ مصرع ہے ؎ سر سے کفن کو باندھ کے آیا ہے تجھ تلک ۔ اس مصرع پر لفظ "بدل" لکھا ہوا ہے اور حاشیے میں وہ مصرع درج ہے، جس کو متن میں لکھا گیا ہے۔

تو مہرباں کبھو ہم پہ ایک دم نہ ہوا
ہوئے جو تجھ پہ ہم عاشق تو کچھ ستم نہ ہوا

وہ گریہ، آہ جو تھا موج زن گریباں تک
سو آج دامنِ مژگاں بھی اس سے نم نہ ہوا

عجب گھڑی سے کچھ آیا تھا سر میں شورِ جنوں
کہ اس دماغ جلانے پہ اپنے کم نہ ہوا

ہے شیخ، اگرچہ ترا کعبہ دیر سے مطبوع
پہ حیف ایسی جگہ میں کوئی صنم نہ ہوا

نہ جانے چشم سے کس کی گرا ہوں میں قائمؔ
کہ جس جگہ پہ گیا، پھیر محترم نہ ہوا

---

جب سنگِ آستانہ ترا تکیہ گاہ تھا
ہم کو بھی کوئے عشق میں اک عزّ و جاہ تھا

کیوں ہم نشیں! وہ دن بھی عجب تھے کہ جن دنوں
اس سنگ دل کے دل میں مرے دل کو راہ تھا

ویراں سرائے سینہ سے آتی ہے بوئے انس
گویا کبھو یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا

گزرا وہ شب، پہ ڈر سے نہ مارا کسو نے دم
عالم اگرچہ بر سرِ رہ دادخواہ تھا

ظالم! کیا تو ہے تو مجھے قتل بے گناہ
پوچھوں گا پھر کبھو کہ مرا کیا گناہ تھا

ہوتا نہ اس کی زلف کا کیوں کر ہمیں خیال
اپنے تو یہ نصیب میں روزِ سیاہ تھا

جیتا ہی ہو خدا کرے قائمؔ، پہ تجھ بغیر
احوال اس جواں کا نہایت تباہ تھا

---

مرتے مرتے بھی نہ جی نے کبھو آرام دیا
وائے قسمت کہ ہمیں یہ دلِ خود کام دیا

کب ہوئی صبح کہ اِس چرخ سیہ کاسہ نے یاں
بھر کے لوہو سے نہ جوں لالہ مجھے جام دیا

سادگی دیکھ کہ میں آج نفہمیدہ مآل
غیر کے ہاتھ اسے ملنے کا پیغام دیا

کیا گلہ شومیِ طالع سے، کہ بلبل کے تئیں
جن نے دی رخصتِ گلگشت، ہمیں دام دیا

دشمنِ دیں ہے وہ سالک کہ نہ جن نے قائمؔ
جرعۂ مے کے عوض جامۂ احرام دیا

---

جلنوں کو پڑنے سے، ہو سوزِ عشق کیا دونا | جو چھڑکیں آب، تو آتش ہو، آن بجھا چونا
بنائے کوئی عمارت، سو کس توقع پر | پڑا ہے قصرِ فریدوں بن آدمی سونا
ہو جورپیشہ ضعیفی میں زیادہ مائلِ ظلم | کہ کاٹتا ہے سر دہی سے بیشتر ادنا
دلوں کی آگ دو بالا ہوئی نہ آخر کار | ملے تھا کیوں تو رُخِ آتشیں پہ گلگونا
خموشی[1] پہ تو نہ جانا رقیب کی پیارے | مگر سنا نہیں، بد ذات ہوئے ہی کیونا (کذا)

جلا جو عشق سے قائم، ہے مطمئن تہِ خاک
اُگے ہے یاں وہی دانہ، جسے نہیں بھونا

---

کیوں کر ہو سخن تمام اپنا | اُس زلف سے ہے کلام اپنا
وہ حوصلہ کو، کہ مثلِ گرداب | دریا سے بھرے نہ جام اپنا
اللہ رے جذبِ الفتِ دل | کس بت کو کیا میں رام اپنا
کس[2] سے ہے گلے کی جا، کہ ہیں یاں | جوں موج، ہم آپ دام اپنا
پہلے ہی گدھا ملے جہاں شیخ | اس کعبے کو ہے سلام اپنا
یاں آئے کوئی بلا کہیں سے | پہلے پوچھے ہے نام اپنا

پر، جائیے کس طرف، کہ قائمؔ
ہے راہ کے سر مقام اپنا

---

اک ڈھب پہ کبھو وہ بتِ خودکام نہ پایا | دیکھا میں جو کچھ صبح اُسے، شام نہ پایا
اپنی ہی ہوس کے یہ سب الجھاو ہیں، ورنہ | اس راہ میں ہم نے تو کہیں دام نہ پایا

---

[1] یہ شعر 'ل' میں نہیں ہے۔ [2] 'ل' میں متن میں یہ شعر لکھا ہوا ہے۔ سہ

کیونکر چھٹیں قیدِ زیست سے ہم | ہر تارِ نفس ہے دام اپنا

پہلے مصرع پر لفظ 'بدل' لکھ کر، حاشیے میں، یہ شعر اُس طرح درج ہے جس طرح ہم نے لکھا ہے۔

وہ نخلِ خزاں دیدہ ہوں اس دشت میں، جس کے
سایے میں کسی پنچھی نے بسرام نہ پایا

وہ بے سروتن ہے یہ زمانہ، کہ بہ ایں غور
جس کا میں کچھ آغاز اور انجام نہ پایا

فہرست میں خوبانِ وفادار کی پیارے
دیکھی، تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا

معمول تھا دشنام عوض اپنی دعا کا
سو وہ بھی کئی دن سے میں انعام نہ پایا

یک شب وہ کہیں گود میں سویا تھا، سو قائمؔ
پھر بالشِ مخمل سے میں آرام نہ پایا

---

دن ہی ملیے گا یا شب آئیے گا
بندہ خانے میں پھر کب آئیے گا

لگ چلی ہی سی ہے ابھی تو میاں
ڈھب چڑھے گا تو کچھ ڈھبائیے گا

ایک بوسے پہ دین و دل تو لیا
اور کتنا مجھے دبائیے گا

جا چکے ہم جب آپ سے پیارے
کیوں نہ اس راہ سے اب آئیے گا

ہم بھی ملّا[1] سے کچھ کریں گے شروع
آپ کس وقت مکتب آئیے گا

کرنے کرنی ہو جو خرید و فروخت
پھیر اس پینٹھ میں کب آئیے گا

اب تو قائمؔ ہے کوچ ہی کی صلاح
یوں گھر اپنا ہے پھر جب آئیے گا

---

جو یاں جیے ہے، تو غافل، بچشمِ نم جینا
کہ جوں حباب ہے عالم میں ایک دم جینا

ترے فراق میں مرکر، کھلا ہے یہ عقدہ
کہ تھی وہ موت، سمجھتے تھے جس کو ہم جینا

ہے طولِ عمرِ خضر سے زیادتی تجھ بن
اگرچہ نیم نفس سے بھی ہوئے کم جینا

سلوکِ عشق کوئی ہر کسی سے ہو ہے کہ یاں
ہر ایک گام ہے مرنا، ہر اک قدم جینا

---

[1] م، ملاں سے

جیا میں جوں ترے ہاتھوں سے درد و غم میں فلک — یوہیں سدا تو گرفتارِ درد و غم جینا
نہ جا کہیں، کہ نظر سے جو یاں گیا سو گیا — ہے مفت وقت کوئی آن یہ بہم جینا
کسی سپاہی پسر کو نہ دیجو دل قائم
کہ اہلِ فن کا ہے عالم میں مغتنم جینا

---

گو تغافل سے میرا کام ہوا — پر بھلا تو تو نیک نام ہوا
غم یہ ہستی کی ہے بنا، کہ حباب — دل کے کھلتے ہی یاں تمام ہوا
نخلِ بے بر ہے اس چمن میں وہ شخص — جس سے کچھ خیر کا نہ کام ہوا
کب تلک آہ و نالۂ بس لے دل — خواب ہم سایے پر حرام ہوا
مول جس دل کا دو جہاں تھا سو آج — اک نگہ پر ترا غلام ہوا
چپ سی کچھ لگ گئی اُسے، جو کوئی — تجھ سے اک بار ہم کلام ہوا
کل کی شب اُس طرح کٹی قائم
آج کا روز پھیر شام ہوا

---

دل وہیں ہوئے گا میرا، وہ جہاں ہوئے گا
پر خدا جانے کہ وہ ہرزہ کہاں ہووے گا
کیا ہوا، جنس کا دل کی ہے اگر آج کساد
آخر اک روز یہی مال گراں ہووے گا
ہاں دلا، جوش ہے گریے کا، نہ کر ضبطِ سرشک
تہ سے ہر مو کی ابھی خون رواں ہووے گا

---

۱؎ م: تھے۔ ۲؎ م: مرا

دل کو کیا باندھے ہے گلزارِ جہاں سے بلبل
حسن اس باغ کا اک روز خزاں ہووے گا

کیوں سچکتا ہے تو اک بوسے کے دیتے، اللہ!
ہم سے لینا، جو ترا اس میں زیاں ہووے گا

جاں سے رکھتا تھا عزیز آہ میں دل کو محرم
کیا خبر تھی کہ یہی دشمنِ جاں ہووے گا

نیک و بد جو تجھے کرنا ہے سو کرلے قائم
پھیر امید نہیں یہ کہ جواں ہووے گا

---

دل چرا لے گئے، اب کدھر کو چلا
اے ترے چور کی کہی تھی بھلا

صبر و طاقت کو روؤں یا دل کو
لگ پڑی آگ، گھر میں تھا سو جلا

ہے تری چشم وہ غزال کہ شوخ
جن نے لاکھوں شکاریوں کو چھلا

ٹل گئے ٹالے آسمان و زمین
اپنی وادی سے لیک تو نہ ٹلا

کیمیا جانتے تو تھے قائم
لیکن اپنے سے دل کا مس نہ گلا

---

عیش و طرب کہاں ہے، غمِ دل کدھر گیا
صدقے میں اس گذشت کے، کیا کیا گزر گیا

کیا کہیے ناتوانیِ غم کی خرابیاں
گر شب میں دل کو جمع کیا، جی بکھر گیا

بس، اب کنارِ دل سے کرلے آرزوئے وصل
زہرِ غمِ فراق مرا کام کر گیا

آئے بھی فصلِ گل، تو ہمیں کیا، کہ ہم نشیں
جس دل میں کچھ ہوا تھی، سو اب دل وہ مر گیا

ہنس ہنس کے ڈالتا ہی یہ کس کے گلے میں ہاتھ
کیا مجھ کو وہ معاملہ شب کا بسر گیا

طوفانِ گریہ کی ہے مرے، حد اک عمرِ نوح — دریا نہیں کہ آج چڑھا، کل اُتر گیا
قائمؔ، معاملوں سے ترے زندگی ہے شاق
اے ننگِ روزگار! کہیں تو نہ مر گیا

---

ہوا سے آہ کی چمکا ہے سوزِ داغ مرا — مدد نے باد کی روشن کیا چراغ مرا
نہ لے ہے یاں سے رکھا اپنی شمیم کو، کہ نسیم — نہیں حریف اس آسیب کا دماغ مرا
ہے جوں حباب وہ کس دم کی زیست جس کے تئیں — کہے یہ بات، کہ خالی رہا ایاغ مرا
ہوا نہ بہرہ کبھو یاں بہار سے اس کو — خزاں کے واسطے گویا بنا تھا باغ مرا
گیا نہیں ہوں میں یاں اُس طریق سے قائمؔ — کہ جستجو سے کوئی پا سکے سراغ مرا

---

صبا! یک بار گلشن تک ہمارے مشتِ پر لے جا
قفس میں ہم پہ جو گزری، سو یاروں کو خبر لے جا
تپِ آسودہ کم لیتے ہیں بازارِ محبّت میں
جو واں جائے تو، ٹوٹا دل کوئی، یا چشمِ تر لے جا
کنارہ کش موج سے کرنا، کوئی مقدور ہے خس کا
میں اور تیری رضا پیارے، جدھر چاہے اُدھر لے جا
طلب میں عشرتِ دنیا کی مت کھو عمرِ دہ روزہ
یہ عشرہ ہے دہے کا سا، اِسے غم میں بسر لے جا
میں کن آنکھوں سے یہ دیکھوں کہ سایہ ساتھ ہو تیرے
مجھے چلنے دے آگے، یا ٹک اِس کو پیشتر لے جا

---

یہی دو چار رنگ یاں گوں ہیں پیارے نام کے تیرے
نہ بھائے دل کا گر ٹکڑا کوئی، لختِ جگر لے جا

چلا جب دل میں لے کوچے سے اُس کے، یہ لگا کہنے
کہ کوئی جائے ہے ناداں یہ تیرے ساتھ، پر لے جا

وہی اک شیشۂ دل تھا، جو توڑا تو نے مستی میں
گماں گر دوسرے پر ہو، یہ گھر ہے ڈھونڈھ کر لے جا

دساور سے کوئی جاتا ہے خالی ہاتھ یوں قائمؔ
بھلا آئے کی گن یاں کے تو کچھ تو جنس بھر لے جا

---

گالی تو دی ہے یار نے، بوسہ نہ گو دیا
آتا تو کچھ نہیں ہے ترا اُس پہ، جو دیا

اظہارِ عشق اُس سے دلا کچھ ضرور تھا
کیا کہیے اپنے ہاتھ سے تیں کام کھو دیا

یوں اپنے اشک کے ہیں تسلسل میں لختِ دل
جوں لعل موتیوں کی لڑی میں پرو دیا

وہ فکر کر کہ آنکھ سے ناصح تھمے لہو
یوں کیا ہوا، جو تو نے تنک جیب دھو دیا

تجھ کو غرور و ناز، ہمیں عجز اور نیاز
جو کچھ کہ تھا کسی نے سزاوار، سو دیا

پوچھ آ کے ہم سے حسرتِ وقتِ دِرَو، کہ ہم
اکثر زمینِ شور میں یاں تخم بو دیا

یک جزوِ دل کی سیر تو اب رہ گئی ہے اور
جو کچھ لکھا پڑھا تھا سو ہم نے ڈبو دیا

گرمیِ نالہ واں رہی ویسی ہی ناگوار
میں گرچہ آہِ سرد سے اُس کو سمو دیا

ہنسنے کا یار یہ بھی کوئی طور ہے کہ آج
قائمؔ نے تیرے ہاتھ سے گھبرا کے رو دیا

---

اِس منہ سے کلام کچھ نہ نکلا
جز یار کے نام کچھ نہ نکلا

کیا تجھ پہ کروں نثار، گھر تو　　ڈھونڈھا میں تمام، کچھ نہ نکلا
سو کھاٹا لا جو ہم کو ساقی　　کیا اِک دو سہ جام کچھ نہ نکلا
ہم سُن کے پھنسے تھے آبِ دانہ　　سو یاں تہِ دام کچھ نہ نکلا
کیا ہوئے گا تجھ سے اے دمِ سرد　　جب آہ سے کام کچھ نہ نکلا
بندے ہیں تمھیں ہزار سے مجھ سے　　گو ایک غلام کچھ نہ نکلا
سوچے تھا میں قافیے کو قائمؔ
جز نامِ امام کچھ نہ نکلا

---

.ں کہ حاصل مجھے کچھ جز غمِ حرماں نہ ہوا　　کون سا کام کیا میں کہ پشیماں نہ ہوا
رہبرِ فرقۂ اسلام رہا ساری عمر　　حیف پر (یہ) ہے کہ میں آپ مسلماں نہ ہوا
طرح سے غنچۂ تصویر کے اِس گلشن میں　　سو بہار آئی، پہ یک بار میں خنداں نہ ہوا
............سر و سامان بہم　　جب ہوا سر تو یہ تحفہ ہو کہ ساماں نہ ہوا
دیکھ مجھ کو کہ مسلماں کا دیا اور مجھے (کذا)　　ایک ........ میں دست و گریباں نہ ہوا
تھا گلِ تازہ، پہ حیف کہ بختِ بد سے　　زینتِ گوشۂ دستارِ عزیزاں نہ ہوا
یاس جب ناخنِ تدبیر سے آئی قائمؔ
کون سا عقدۂ مشکل تھا کہ آساں نہ ہوا

---

ہم سے بیچاروں کا کچھ چرخ نے چارا نہ کیا　　سب کیا اِن نے پہ کچھ فکر ہمارا نہ کیا
سیکڑوں صلح کے انداز کیے گردوں نے　　اِس کمینے سے پہ ہم نے ہی مدارا نہ کیا
دل میں آ دل میں، کہ یاں گھر کے جو بیٹھا، اُن نے　　میلِ ہم بزمیِ اسکندر و دارا نہ کیا
غیر کیا جانے تلوہ ایسی طرح سے پیارے (کذا)　　ایک کیا کیجے تنک تو نے اشارا نہ کیا

ڈول دیکھنے کا مرے دل کے، وہ کیا سمجھے گا　　دردِ پہلو سے جو تا صبح پکارا نہ کیا
جی ہمارا ہے کہ آنکھ اُس سے لڑتے ہیں مدام　　جس کو خورشید نے بے پنجہ نظارا نہ کیا
قائمؔ اب عشق میں پھنس چاک کے جو ڈھونڈھے ہی نجات
کیوں تو پہلے ہی مری جان کنارا نہ کیا

---

مرے دماغ سے مانوس ہے شمیمِ صبا　　کسی کے کوچے سے آئی مگر نسیمِ صبا
قفس سے مشتِ پر اپنے تو باغ تک لے جائے　　ولے کہاں ہے وہ اب الفتِ قدیمِ صبا
مصاحبت سے مجھے گُل کی بہرہ کیا، کہ مدام　　برنگِ نکہتِ گل ہوں میں یاں ندیمِ صبا
گلِ شگفتۂ دیروزہ ہوں میں گلشن میں　　زیادہ بادِ خزاں سے ہے مجھ کو بیمِ صبا
ترے سخن سے ہے قائمؔ یہ وا شُدِ دلِ تنگ
گویا کہ ہے تو اس آئین میں سہیمِ صبا

---

کس کس کی یاد دل میں رکھے ہوشِ نقشِ پا
سو قافلے ہوے ہیں فراموشِ نقشِ پا
ہشیار چل، کہ تجھ سے جو چلتے پیچھے تو کیا
لاکھوں دبے ہیں پانو تلے دوشِ نقشِ پا
کیا ہوئیں گے وہ پانو، کہ جن کے، ہوا کے بیچ
اب تک کھلے ہیں ویسے ہی آغوشِ نقشِ پا
قسمت، کہ کل وہ جوشِ گُل اِس گلستاں میں تھا
پیدا نہیں کچھ آج بجز جوشِ نقشِ پا
پامال اِسے کیا جو فلک اِس طرح سے تئیں
تھا حامل اِس جفا کا تن و توشِ نقشِ پا

افتادگی ہے گرچہ مری اُس پہ سب عیاں
تو بھی یہ کھول دیجو صبا گوشِ نقشِ پا
گوشِ تمیزِ خلق جو قائمؔ نہ ہوں گراں
یکسر بیاں ہے صورتِ خاموشِ نقشِ پا

---

منت سے کس کی، جس میں کہ کانٹا ہو ننگ کا (کذا) خالی ہے نت خزاں سے میں پیالہ تفنگ کا
ظالم سے کر نہ عجز، کہ رونے پہ زخم کے سوفار خندہ زن ہے ہمیشہ خدنگ کا
ہو نیک و بد میں اہلِ جہاں کو اگر تمیز ہو وے نہ مول شہد سے زیادہ شرنگ کا
یہ پاسِ دیں ترا ہے سب اُس وقت تک کہ شیخ دیکھا نہیں ہے تو نے وہ کافر فرنگ کا
کیونکر کروں میں صلح کہ اونا سبب یہ آہ آمادہ ہے وہ شوخ مرے ساتھ جنگ کا
ممنوں نہ ہوں کسی کے شکستہ پئے عروج وہ پر ہیں اور، جن سے ہے پرواز رنگ کا
جرأت سے مرد شہرۂ آفاق ہو کہ دیکھ مشہور تر ہے شمع سے جلنا پتنگ کا
قائمؔ اگرچہ اور بھی شاعر بہت ہیں لیک
بندہ ہوں ہوں جی سے میں تو ترے رنگ ڈھنگ کا

---

کھول مکھڑا تو نے، ہم جلتوں کا چارا کیا کیا
بھڑکی ایک اور آگ، ٹک تجھ کو نظارا کیا کیا
غیر اگر بوسہ نہ کرتا تھا طلب تم سے، تو رات
سچ کہو، آن نے یہ ہونٹھوں کا اشارا کیا کیا
اب بھی جو جی میں ہو کہہ لو شوق سے، دہشت ہی کیا
گالیاں جب دی تھیں تب ہم نے تمھارا کیا کیا

---

گل کو شرمایا کہ آویزہ نہ شبنم کا کرے
زیبِ گوش اے شوخ تو نے گوشوارا کیا کیا

ہم کنارِ گور آ پہنچے ہیں دوری میں تری
تو نے اس احوال میں ہم سے کنارا کیا کیا

پوچھے کوئی چرخ سے اتنا کہ اُس حشمت پہ آہ
تیں وہ اسکندر کہاں کھویا ، وہ دارا کیا کیا

کرکے قائم اس بتِ کافر سے تو نے اختلاط
آپ ہی یہ ذلتیں کھینچیں ، ہمارا کیا کیا

---

کس منہ سے یہ گھر ہوئے اندھیرے سے اُجالا
بے ماہ مرے ، سلمہ اللہ تعالیٰ

افتادہ میں اُس دشتِ بلا خیز کا ہوں یاں
گرتے کے تئیں جس کے کسی نے نہ سنبھالا

نے جذب سوے شہد ہو ، نے زہر سے رم کر
بندہ ہے ، تو جو کچھ کہ وہ دے حکم ، بجالا

مستی نہ چڑھے کیوں کے تری چشم سے پیارے
گرتی ہی ہے مے ، ہوئے جو لبریز پیالا

مشکل ہے تبِ عشق مرے جائے بدن سے
کب جرم سے ہو آگ کے گرمی کا ازالا

کیا چشم سے آنسو کی وفا دیکھی تھی اے دل
یہ طفل جو نادانی سے تیں گود میں ڈالا

دے کیونکے کوئی قد سے ترے سرو کو تشبیہ
موزونی کا کام اس کی کہیں اس سے ہے بالا

خورشید کب اس طرح شفق سے ہو نمایاں
جوں چاند سے منہ پہ ہے ترے سرخ دوشالا

دل وہ ہے، جو ہو داغِ محبت سے مزیّن
بے مُہر، سند کا ہے کو ہوتا ہے قبالا

دل چھینے ہے نرگس کی بھی یوں چشم، پہ قائم
اُن آنکھوں کا سالائے کہاں سے وہ چھنالا

---

ہے عبث شکوہ، دل، اس شوخ کی بیدادی کا
نالہ یاں کون سنے ہے کسی فریادی کا

گوشۂ چشمِ غمِ یار ہے جب تک کہ اِدھر
کون کافر ہے جو طالب ہو کسی شادی کا

کی وفا کس سے بھلا فاحشۂ دنیا نے
ہے تجھے شوق جو اس قحبہ کی دامادی کا

طولِ قدِ حُمق کا موجب ہے، وگرنہ کیوں سرو
اتنی پابندی پہ دعوا کرے آزادی کا

شہرِ معمورِ دل، اس طرح ہوا آہ خراب
نام گویا کہ نہ تھا یاں کبھی آبادی کا

خضر کے منہ میں بھر آیا ہی حسرت سے آب
سن کے شور اُس دمِ شمشیر کی جلادی کا

اس سے ناخوش ہو نہ خوش اُس سے کہ تا تو ہو مدام
شارعِ دل ہے گزرگاہ غم و شادی کا

ہے تو تو فنِ سخن بیچ مُسلّم قائم
معتقد گو نہ کوئی ہو تری استادی کا

---

# ب

انشا نہ ہوئے کیونکے بھلا رازِ عندلیب
ہو دیں جب آہ و نالے سے دمسازِ عندلیب

نکلی اُدھر زباں سے، اِدھر جی نکل گیا
کیا جانے کیا بلا تھی کچھ آوازِ عندلیب

پابندیِ وفا ہے سب اے گُل، وگرنہ خیر
باندھے ہیں کن نے یاں پر پروازِ عندلیب

مدت رہا ہے زاغ کا میرے وہ ناقبول
جس مصرعِ صفیر پہ ہے نازِ عندلیب

قائمؔ، دکھایئے تجھے گُل کا شکوہ و شان
آجائے گر وہ خانہ براندازِ عندلیب

---

آج قائمؔ، تجھے آئے گی نہ جانے کب خواب
رو کے تھمتا ہے تو جس دم، تو اُبلیے ہے آب

آج ہے اہلِ قلم کون مری مژگاں سا
بحر کے قطروں کا انگشت پہ کر لے جو حساب

ہائے رے شام وہ جانا ترا گھر کو بہ خوشی
ہاتھ میں گوشۂ دامان و بغل بیچ کتاب

جوں شرر ہو ہے تو کس جینے پہ اتنا سنگیں
ایک چشمک میں گزر جا ہے یہ سب شیب و شباب

مہرگو آپ کو گنتا ہے فلک پہ پیارے
پر ابھی خاک میں مل جائے، جو کھولے تو نقاب

آستاں تک یہ ترے دیکھیے پہنچے کب تک
ایک مدت سے مری خاک کی ماٹی ہے خراب

کیا وہ بت عشق کے قابل تھا ہمارے قائمؔ
کیجے پر کیا کہ میاں یہ بھی خدا کے اسباب

---

ایک بھولے ہیں نہ تجھ بن دیدۂ بے خواب خواب
لینے یاں دیتا ہے کس کو یہ دلِ بیتاب تاب

خاک ہے اس مہرِ گردوں پر، کہ یوں ماٹی کے بیچ
صورتیں کیا کیا دیں ان نے خرم و شاداب داب

---

ل ، دی

میں درِ دولت پہ ہوں جب تک نہیں ٹیڑھی نگاہ
ہوئیں گے اِس سرزنش کے اور ہی احباب باب

مت دوپٹے سے میاں چہرے کو اتنا کھول مونڈ
لائے گا اِس ڈھب کے جھکھوروں کی کب مہتاب تاب

اپنے گریے سے بھی میں شور و شغب پر دنگ ہوں
جوش نے جس کے دیے ہیں سیکڑوں گرداب داب

بزمِ خوباں میں نہ بے باکانہ آ، اے بوالہوس
ہے تواضع طور اس مجلس کا اور آداب داب

حلقہ ساں بیرونِ در قائم رہے کب تک مقیم
کھول دو اس کے بھی منہ پر یا اولی الالباب باب

---

رات کو چین ہے، نہ دن کو تاب — دل ہے یا رب کہ پارۂ سیماب
جائے بودن نہیں یہ بحرِ جہاں — خانہ بر دوش رہ تو مثلِ حباب
داغِ دل کو میں کس طرح سے گنوں — اِن کے اعداد کا ہے کون حساب
ہم دِوانوں کو بس ہے پوشش سے — دامنِ دشت و چادرِ مہتاب
[1] دل کے تابع ہیں جو ہوا سو کیا — ہم سمجھتے نہیں ثواب و عذاب
جس کو ہے گوہرِ وجود کی قدر — ہو ہے قربان اپنے جوں گرداب
اب کہاں ہیں، کدھر ہے اے ناصح — یہ بھی تھا مقتضائے عہدِ شباب
دل گنوانا تھا اِس طرح قائم — کیا کیا تو نے ہاے خانہ خراب

---

[1] مخطوطے میں اس شعر پر "بدل" لکھ کر حاشیے میں وہ شعر درج ہے جس کو متن میں اس کے بعد لکھا گیا ہے۔ کاتب کی مراد لفظ "بدل" سے غالباً یہ ہے کہ اس شعر کے بجائے درج حاشیہ شعر یہاں لکھا جائے۔ ہم نے ازراہِ احتیاط دونوں شعروں کو درج کیا ہے۔

## ت

ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت — تم سلامت رہو، بندے کے خریدار بہت
ہم دگر جب خفگی آئی، تو جھگڑا کیا ہے — تم کو خواہندہ بہت، ہم کو طرحدار بہت
آج کے رونے میں جی ڈوب چلا تھا لیکن — نالۂ دل نے رکھا مجھ کو خبردار بہت
شیخ، مجھ کو نہ ڈرا گور کی اندھیاری سے — ہجر کی کاٹی ہیں میں نے تو شبِ تار بہت
دیکھیے اب کے تبِ عشق سے کیونکر بچیے — غالب آیا ہے طبیعت پہ یہ آزار بہت
سچ کہو، قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے — اِن دنوں ہاتھ میں رکھتے ہو تلوار بہت

قائمؔ آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اِسی آزار کے بیمار بہت

---

تا چند، سخن سازیِ نیرنگِ خرابات — یاں قصدِ خرابی ہے، نہ آہنگِ خرابات
آ دل میں، کہ اس در پہ جو بیٹھا ہی پھر اُن نے — فرسخ گنے کعبے کے، نہ فرسنگِ خرابات
دیکھیں تو تری دھوم تلک اے شورشِ مستی — پھر آج سرِ سینہ ہے اور سنگِ خرابات
تشبیہ میں جس دل کو نہ دی کعبے سے، سو دل — اب عشقِ مے و مغ سے ہے ہم رنگِ خرابات
اے غنچہ دہن، بس، لبِ میگوں کو تنک موند — دل تنگ کہاں تک ہو دلِ تنگِ خرابات
سو سر کا جو ہو آڑے تو مقبول نہیں یاں — کھائی نہیں جس رند نے سر جنگِ خرابات

کس نام سے قائمؔ میں تجھے کہہ کے پکاروں
اے عابدِ درِ مسجد و اے ننگِ خرابات

---

زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات — ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات

اس کے مکھڑے پہ زلف کو ٹک دیکھ | کیونکہ اینڈے ہے آفتاب میں رات
رکھ لیا ضبطِ گریہ تیں ، ورنہ | ہم تو بہ ہی چلے تھے آب میں رات
جو نہ ہو اُس شمارِ زلف میں صرف | زیست کے ہے وہ کب حساب میں رات
بے حجابانہ وہ تو وارد تھا | رہ گئے ہم ہی کچھ حجاب میں رات
ہم نشیں، گر نہ روکے تو ہمیں | بات بہکی ہی تھی شراب میں رات
ذکرِ ہر در سے ہم کیا لیکن | کچھ نہ بولا وہ دل کے باب میں رات
دن لگے شیخ کو بھی اب، کہ سدا | مے کے کاٹے ہے ارتکاب میں رات
خوب نکلے ہم اُس کے کوچے سے ق | ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل | دل گرا شاید اضطراب میں رات

دل مکدر رہیں نہ کیوں قائمؔ
صاف کاٹی ہے ہم نے خواب میں رات



---

چاہیں ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاک محبت | پر جس میں یہ دوری ہو، وہ کیا خاک محبت
آ عشق، اگر قصدِ تجارت ہے، کہ اس جا | ہیں تو وہ ہر اک گھر دو سہ افلاک محبت
ناصح، تو عبث سعی کے نہ رسوا ہو، کہ ظالم | رکھتا ہے گریباں سے مرے چاک محبت
اپنے تو لیے زہر کی تاثیر تھی اس میں | گو[1] واسطے عالم کے ہو تریاک محبت
بلبل[2] تو ہوں قائمؔ میں، پر اس باغ کا جس میں | بے رتبہ ہے مثلِ خس و خاشاک محبت

---

شعلہ[3] ہو دل سے گزرا آخر شرارِ اُلفت | باقی ہیں داغ کتنے اب یادگارِ اُلفت

---

۱؎ م، اب گو کہ پے خلق ہو تریاک محبت
۲؎ م قائم ہوں میں اس باغ کا بلبل کہ جہاں یار
۳؎ یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

## ث

نہ پوچھ گریۂ خوں کا مرے ہے کیا باعث
سبب تو اور نہیں کچھ، مگر ترا باعث

اگرچہ شیخ، ہے پینا شراب فعلِ شنیع
یہ کیا کروں کہ کئی دن سے تھی ہوا باعث

دوچند گریے کی تبرید سے ہوئی تبِ عشق
زیادتی کی مرض کے ہے یاں دوا باعث

نہ جرم اس کا ہے ثابت، نہ کچھ مری تقصیر
خدا ہی جانے کہ رنجش کا کیا ہوا باعث

رہا میں اُس سے گرفتہ اک عمر تک، لیکن
کیا جو خوب تأمل، تو کچھ نہ تھا باعث

طرح اُس آب کے، جو بیر نے سے ہو درہم
ہوئے ہیں میرے [2]تشطّط کے آشنا باعث

کبھو کھلا نہ دمِ سرد سے یہ دل قائمؔ
اگرچہ کھلنے کی غنچے کے ہے صبا باعث

---

آج سمجھے، کہ تھی سب سعیِ دلِ زار عبث
اتنی مدت ہوئے ہم غم میں ترے خوار عبث

رسم اس گھر کی نہیں داد کسو کی دے کوئی
شور و غوغا نہ کر اے مرغِ گرفتار عبث

عیشِ یک شب کا بھی سامان مہیا نہ ہوا
رہنِ مُغ ہم نے کیا جبہ و دستار عبث

[3]یاں تو ان بھنگی نگاہوں ہی میں بس سکتے ہیں ہم (کذا)
کھینچے ہے تیغ تو اے شوخِ جفاکار عبث

[4]تو ہے وہ جنس ہی پیارے کہ تردد سے ملے
خاکِ رہ چھانتے پھرتے ہیں خریدار عبث

[5]قائمؔ اسی قصے سے واقف ہوں میں جوں جام سے لب
اس کے ملنے کا ہے مجھ سے تو یہ انکار عبث

---

۱ ل، ترے
۲ م، تشنط
۳۔۴۔۵۔ یہ شعر ل، میں نہیں ہیں۔

## ج

مانگے ہے ترے ملنے کو بے طرح سے دل آج
کل کیا ہے، جو ملنا ہے مری جان، تو مل آج

پھر صبح سے آشوبِ قیامت ہے جہاں میں
چہرے پہ ترے کن نے بنایا ہے یہ تل آج

اے گریہ، تو خاطر سے مری کیجو نہ صرفہ
میں خونِ دلِ خستہ کیا تجھ پہ بحل آج

چاہے ہے اگر گل کو تری نشو و نما ہو
دل کھول کے دانے کی طرح خاک میں مل آج

کیا سینہ جو ترچھیوں کو نگہ کے تری جھیلے
اِس تیر سے رہ جاے نہ فولاد کی سل آج

یارب نہ پڑے اصل سے اپنی کوئی یاں دور
یہ آب تھا سب، جتنی کہ دیکھے ہے تو گل آج

قائمؔ، یہ غضب کل تو نہ ٹوٹے تھا ترے پر
دیکھا ہے کہیں تیں وہ بتِ مہر گسل آج

---

اے وہ کہ تو کرے ہے ہر آزار کا علاج
جز مرگ کچھ بھی ہے مرے بیمار کا علاج

بجاے نمک جو سودۂ الماس آئے ہاتھ
بہتر ہے اس سے کیا دلِ افگار کا علاج

اے ضبطِ گریہ، روئیے کیونکر نہ اب لہو
کچھ ہو سکا نہ دیدۂ خونبار کا علاج

نظریں پھری یاں سب کی اُسے دیکھ کر، اب آہ
یاروں کا فکر کیجے کہ اغیار کا علاج

خونِ جگر میں دے کے، تب دل دو چند کی
جس طرح گھر میں کرتے ہیں نادار کا علاج

برسات سر پہ آئی جو کرنا ہے شیخ جیو
کر لیجے جلد گنبدِ دستار کا علاج

قائمؔ، لگے ہیں روگ ہو اغیار اُس کے ساتھ
بہتر تو ہے جو کیجیے دو چار کا علاج

---

# چ

دردِ بن، کب ہوا اثرِ نالۂ شبگیر کے بیچ
کارگر کیا ہو وہ پیکاں نہیں جس تیر کے بیچ

بندِ اسباب میں ہرگز نہ رہیں وارستہ
کب ٹھہرتی ہے صدا حلقۂ زنجیر کے بیچ

تشنہ لب مر گئے کتنے ہی ترے کوچے میں
ظاہرا آب[۱] نہ تھی تجھ دمِ شمشیر کے بیچ

ناصحا پوچھ نہ احوالِ خموشی مجھ سے
ہے یہ وہ بات کہ آتی نہیں تقریر کے بیچ

دیر آنا بھی ہے اک لطف، نہ یاں تک ظالم
جی ہی جاتا رہے اک شخص کا تاخیر کے بیچ

بس کر اے گریۂ روزانہ تری بار ہے اب
کچھ ہوا آگئے[۲] اثر نالۂ شبگیر کے بیچ

کر تردد بھی تو قائم جو ملی دولتِ فقر
جس کو تو ڈھونڈھے ہے کیا خاک ہے اکسیر کے بیچ

---

اے زیست، زیست وہ تھی، جو کاٹی عدم کے بیچ
گزری تجھ عہد میں تو عجب درد و غم کے بیچ

پیارے قسم ہے تجھ سا جو دیکھا ہو راست باز
سچی نہیں ہے ایک ہزاروں قسم کے بیچ

[۳] رکھتے ہیں نالہ سینے میں ہم یوں سیاہ بخت
ہوتا ہے نال جیسے کہ پنہاں قلم کے بیچ

---

۱ م، آب نہیں    ۲ م، اس کے

۳ م، میں یہ شعر یوں ہے ؎

سینے میں چند نالہ چھپا ہیں یاں مدام (کذا)    جوں صوت خامہ ہوئے ہمیشہ قلم کے بیچ

جانے تو اس بلا کو نہ چھیڑ اے مژہ نہ چھیڑ (کذا)
طوفاں دبے پڑے ہیں مری چشمِ نم کے بیچ
واں نہ ہوں میں تو مستی پہ تجھ چشم کی کہ شوخ
پیتی ہیں مے یہ عین مقامِ حرم کے بیچ
تکلیف نالہ کر نہ مجھے، آ، خدا کو مان
کیا جانے کیا غضب ہو ابھی ایک دم کے بیچ
قائمؔ، رہا جو شرک ہی ہستی کا تو میاں
پوچھوں ہوں میں تجھے کہ وہ کیا ہے صنم کے بیچ

# ح

تجھ پہ شب[1] جاگے سے، کیفیت جو کچھ آتی ہے صبح
حسنِ نورِ شمع کب اِس طرح دکھلاتی ہے صبح

زلف میں مضطر ہے دل دیکھے سے تجھ کانوں کے لوک
چور کو جوں غیب کے گھر بیچ ہو جاتی ہے صبح

نازِ مہر دیاں اُٹھانا، گر نہیں پیری میں عیش
کیوں گریباں مہر کے پنجے سے پھڑواتی ہے صبح

نہیں شفق لب پر ترے پیارے غبارِ خط کو دیکھ
ہر سحر گہ رشک سے خونِ جگر کھاتی ہے صبح

مجھ کو قائمؔ، وصل کی شب سے ہے کیا شادی کہ یاں
گر یہی جھگڑے ہیں، کوئی دم میں ہوئی جاتی ہے صبح

---

لوٹنا خوں میں گلستاں کی طرح — کہ تو اے دل، یہ ہے کہاں کی طرح
بے کسی اپنی کس کو سونپ مروں — میں تو رکھتا تھا اِس کو جاں کی طرح
ایک مدت کی مشق بلبل نے — پر نہ آئی مری فغاں کی طرح
آگے صیاد کے تو کہیو نسیم — جو ہوئی میرے آشیاں کی طرح
جاے اک زخم نہیں مرے تن پر — کون سی ہے یہ امتحاں کی طرح
کیوں کے جا دل سے اس نگاہ کی یاد — جی میں گھر کر گئی سناں کی طرح
اب تو جو ہونی ہو سو ہو قائمؔ — کھب گئی جی میں اُس جواں کی طرح

---

[1] م، کیفیت شب جاگنے سے تجھ پہ جو آتی ہے صبح

گردش میں ہوں میں رات دن ایام کی طرح — یہ چال ہے تو کون سی آرام کی طرح
شوخی سے گو نگہ کی چھپنیں پردہ ہائے چشم — پر یاں نہ کھول آنکھ تو بادام کی طرح
نے منہ سے تو لگا کے نہ دے غیر کو، کہ شوخ — یہ بھی ہے ایک بوسہ بہ پیغام کی طرح
چلیے بس اب، کہ ہے دلِ ناکام اگر یہی — آتی نہیں کچھ ہم کو نظر کام کی طرح
غافل نہ ہو فریب سے تو شیخ کے کبھو — یکساں ہو گو کہ خاک سے وہ دام کی طرح
قائم ہر اک کا کام نہیں دعوئ سخن — سیکھ آکے یاں جو سیکھے تو انعام کی طرح
لاکھوں خزانے بخشتے ہیں، پر شرمِ جود سے — سر تا بہ پا عرق ہوں میں حمام کی طرح

---

کچھ نہ پوچھ اے ہمنشیں اپنے تو جل جانے کی طرح
جا رہے ہم آگ میں اندھے ہو پروانے کی طرح
یہ صفا ہے، منہ پہ کہہ دیجے جو ہو، آئینہ وار
بیٹھ پیچھے موشگافی عیب ہے شانے کی طرح
شعلہ درہم شمع کا جب باد سے ہو ہے کہیں
یاد آ جا ہے مجھے اُس کے وہ جھنجھلانے کی طرح
اے فلک ظاہر کی میرے تو خرابی پر نہ جا
اب بھی کتنے گنج یاں مخفی ہیں ویرانے کی طرح
مدتوں خدمت کی مسجد کی، بس اب کب تک دلا
آ کوئی دم یہ بھی دیکھیں کیا ہے بت خانے کی طرح
کل وہ مجمع ساتھ تھا، اور آج یہ صحبت کہ آہ
کس دن آیا ہے تو اے بے مہر یاں آنے کی طرح
کس کو دی قائم فلک نے مفت یاں نشو و نما
خاک سے جب تک نہ یکساں کر لیا دانے کی طرح

# خ

چاہے نہنگ و بحر جو کوئی برنگ سُرخ　　آنکھیں یہ بحرِ خوں ہیں اور آنسو نہنگِ سرخ
مشہد سے کشتگانِ ستم کے ترے ہنوز　　نے کی جگہ اُگے ہیں ہمیشہ خدنگِ سرخ
ہو کیوں نہ آنسوؤں کو مرے لختِ دل کا چاہ　　آڑے ہے دیکھ لڑکوں کو اکثر پتنگِ سرخ
جیسے ہو لعل ٹانک سے یاقوت پر بہار　　دونا بھلا لگے ہے ترے بر میں رنگِ سرخ
قائمؔ کیا ہے نازبتاں نے مجھے شہید
لوحِ مزار کیجو مرا لے کے سنگِ سرخ

---

یوں تو دنیا میں ہر اک کام کے اُستاد ہیں شیخ
پر جو کچھ آپ میں فن ہیں وہ کسے یاد ہیں شیخ
سبھی بندے تو خدا کے ہیں، پر اتنا ہے فرق
تو گرفتارِ تعیّن ہے، ہم آزاد ہیں شیخ
ہم تو مرجائیں جو اک[1] دم یہ کریں صوم و صلوٰۃ
کیونکہ جیتے ہیں وہ جو آپ کے منقاد ہیں شیخ
دخترِ رز تو ہے بیٹی سی ترے اوپر حرام
رند، اس رشتے سے، سارے ترے داماد ہیں شیخ
رشک[2] کرتا ہے تو کیوں دیکھ کے قائمؔ کا قبول
زور کیا ان میں ہے جو کام خدا داد ہیں شیخ

---

[1] م، جو اک دن۔ [2] ل، میں یہ مقطع حاشیے پر درج ہے، متن میں اس کے بجائے یہ مقطع ہے ؎
تھوڑی سی بات میں قائمؔ کی تو ہوتا ہے خفا　　کچھ جو مرزو گئیں اپنی بھی سمجھے یاد ہیں شیخ
اس پر لفظ "بدل" لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بجائے درج حاشیہ مقطع کو متن میں لکھا جائے۔

تیرگی ہے کیوں یہ سیہ نامہ اِس قدر گستاخ
کہ پانو پہ ترے رکھتی ہے زلف سر گستاخ

عجب ہی لطفِ تماشا ہے دل کہ دو ہم جنس
ہوں حرفِ رازِ محبّت میں یکدگر گستاخ

ہے منتِ آئنہ دیدارِ مہوشاں کہ اُنھیں
کبھو ہوا نہ کہ دیکھا میں یک نظر گستاخ

خدا ہی خیر کرے، بات بےطرح ہے کچھ آج
کہ وہ بگاڑ پہ ہے اور پیامبر گستاخ

چمن زمانے کا، غافل، محلِ عبرت ہے
جو آگیا ہے تو یاں سے تو مت گزر گستاخ

ادب سے آدمی آنکھوں میں خوب لگتا ہے
مگر یہ فرقۂ خوباں ہو جس قدر گستاخ

بتاں کے ربط سے قائمؔ خلل ہے حرمت میں
خدا کے واسطے اِس قوم کو نہ کر گستاخ

## د

جی بھی لے ، دل لیا ہے تو چل ، یک نہ شد دو شد
تا پھر وہ تازہ ہوئے مثل ، یک نہ شد دو شد

بد خو تھا ایک تو وہ یوہیں ، تس پہ ہم نشیں
اغوا پہ غیر کے ہے عمل ، یک نہ شد دو شد

وعدہ جو کل کا آج پہ تھا ، سو ہوا خلاف
پھر آج آپ کہتے ہیں کل ، یک نہ شد دو شد

تھا اک شبِ فراق سے عاشق کا دن سیاہ
آئی اب اُس پہ شامِ اجل ، یک نہ شد دو شد

پہلے تو وہ نگاہ ہی ٹیڑھی تھی مجھ سے ، یک
پڑتے ہیں اب تو بھوں میں بھی بل ، یک نہ شد دو شد

کل صبر[1] و طاقت اُس کی گلی میں ہوئے تھے گُم
خالی ہے آج دل سے بغل ، یک نہ شد دو شد

قائمؔ ، وہ چھیڑ سے تو اسی دن کی تھا بتنگ
تس پر ہوا یہ رات خلل ، یک نہ شد دو شد

---

حلقۂ زلفِ شب آسا میں ترا روئے سفید
طُرفہ چوگاں ہے سیہ تاب و عجب گوئے سفید

صبح کیوں صبح دشفق چرخ پہ رہتے ہیں مدام
گر مِے سرخ نہیں لازمۂ موئے سفید

---

[1] ل ، میں "صبر و طاقت" پر "ق" لکھ کر ، حاشیے میں "کل طاقت اپنی" لکھا گیا ہے۔

بردِ پشمینہ پھرے کون سنبھالے اپنی
بس ہے ڈھپنے کو بدن چادرِ گیسوے سفید

صحبتِ پیر و جواں کیوں نہیں جچتی یا رب
ہر سیہ یاں تو خوش آیند پہلوے سفید

اہلِ جوہر کو ہے کیا خاک نشینی سے زیاں
ملگجے ہوتے ہیں کب گرد سے لولوے سفید

کیوں نہ ہو فرضِ گشش نفس کی پیری میں کہ شیخ
ہے ہلالِ رمضاں حلقۂ ابروے سفید

ناقہ ساں نسبتِ پیری ہے خطا قائمؔ پر
مانعِ گرمیِ دل ہو ہیں کوئی موے سفید

---

نے غم اُس کے نے لیا دل کو، نہ کی جان پسند
اور کیا چیز ہے گھر میں کہ ہو مہمان پسند

دل کی بے چینی سے یہ نقش ہے جی پر کہ کہیں
آگئی پھر کسی کافر کی کوئی آن پسند

آہ کیا پیشہ کریں ہم، کہ بجز مہرِ بتاں
اپنے جی کو تو نہ آیا کوئی عنوان پسند

وائے اِس دل پہ کہ اسبابِ طلب ہے مطلق
آہ اِس سر سے کہ اصلاً نہیں سامان پسند

گو کہ قائمؔ یہ کہے، فرد ہوں میں شعر کے بیچ
پر سخن چاہیے ایسا کہ ہو دیوان پسند

---

اب تو نے گل، نہ گلستاں ہے یاد
اُسی مکھڑے کی ہر زماں ہے یاد

ہم نشیں، کہہ لے قصۂ مجنوں
ہم کو بھی دل کی داستاں ہے یاد

غنچہ کاٹے تھا جس کو دیکھ کے لب
کیوں صبا! تجھ کو وہ دہاں ہے یاد

متصل مرغِ دل جو تڑپے ہے آج　　کس کی سینے میں پرفشاں ہے یاد
سبقِ گریہ اشک کو کیا دوں　　آپ ہی اس طفل کو رواں ہے یاد
گُل سے کیا مختلط ہوں اے بلبل　　مجھ کو وہ آفتِ خزاں ہے یاد

آہ اے پیرِ چرخ، قائم نام
یاں جو رہتا تھا اک جواں، ہے یاد

---

سب کو آیا ہے ترے حُسن کا یاں طور پسند　　گرچہ ہر ایک کی زمانے میں ہے ایک اور پسند
خوش کب آتی ہے اُسے مہر و وفا خوباں کی　　جس کو آیا ہے مری جاں ترا جور پسند
منصفی حسن کی اعمیٰ پہ مقرر ہو اگر　　لاکھ خوباں میں کرے تجھ کو وہ فی الفور پسند
دردِ سر سمجھے ہے وہ صندلِ سیمائے بتاں　　جس کو پیشانی کا آیا ہے تری گھور پسند

یہ غزل گرچہ بظاہر نہیں اتنی قائم
پر، کریں گے اِسے ذی فہم پس از غور پسند

---

کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہے صیّاد
ترے قفس سے، چمن مجھ پہ تنگ ہے صیّاد
ہوا ہے تارِ نفس، رشتۂ پرِ پرواز
ہمیں تو زندگی قیدِ فرنگ ہے صیّاد

---

# ذ

زبس کہ ہے مری تحریر سے بجاں کاغذ — صریرِ خامہ سے کرتا ہے نت فغاں کاغذ
لکھوں میں کیونکے کتابت تجھے کہ رونے سے — سوائے چشم سفید اب رہا نہ یاں کاغذ
مرا جو خط اُسے پہنچا ہے اس ہنر سے وہ شوخ — ملے ہے پانو سے دیکھے ہے اب جہاں کاغذ
کرے تو پرچۂ خط سے ہمیں تو یاد، ولیک — ترے دیار میں کیدھر قلم، کہاں کاغذ
اُگے ہیں خاک سے مجھ تیرہ بخت کی گل یاس — ہو بعد جلنے کے جس طرح زرفشاں کاغذ
سفید اب کی میں بھیجوں گا خط، کہ تا اس کو — دے انتظار سے مجھ چشم کے نشاں کاغذ

ہے دیر، یار سے پہنچا نہ خط، مگر قائمؔ
ہوا قلمروِ اُلفت میں کچھ گراں کاغذ

---

کس قدر ہے لبِ شیریں کا ترے نام لذیذ
لب پہ وہ گزرے تو اک دیر رہے کام لذیذ
ساتھ تم بوسے کے گالی دو، کہ سمجھوں میں یہ بات
بوسہ اُس لب کا گوارا ہے کہ دشنام لذیذ
جن نے چکھا ہو ترے سیبِ ذقن کو، سمجھے
کہ ہے کس مرتبے میں یہ، ثمرِ خام لذیذ
میٹھی چتون میں مزہ کرتی ہیں آنکھیں اس کی
آرے، بے قند کے کب لگتے ہیں بادام لذیذ
گفتگو صاف عجب لطف رکھے ہے قائمؔ
گرچہ ہیں شعر کے واقع میں سب اقسام لذیذ

## لہ

نہ ہوئے شاق کیونکر ہم فن اپنا نفسِ بد رگ پر
بلے، دیکھے سے سگ کے، زندگی دشوار ہے سگ پر

غریب آزار ہے وہ شخص، جو پالے ہے موذی کو
کہ قوت باز کو دینا، ستم کرنا ہے لگ لگ پر

شگفتہ ہوے جوں گل، پی کے پیارے جامِ گلگوں کو
کہ جا ہے موسمِ گل بادہ کے گلگونِ خوش تگ پر

ہمارے شیخ جی بھی آپ کو کتنا تراشیں ہیں
سجاوٹ اوپر اِس داڑھی کے اور پگڑی کی اس کھگ پر

کجی میں اہلِ دل کی راستی مضمر ہے اے غافل
ہو سیدھا نقش، جو اُلٹا لکھا دیکھے ہے تونگ پر

ترے خونابہ کش، نیشِ غمِ دوراں سے ایمن ہیں
نہ دیکھا، نیشتر مارے کوئی یاقوت کی رگ پر

نہیں گر خاکساری دہر میں پیشہ بزرگوں کا
تو کیوں ڈالے ہے پیل اپنی ہمیشہ خاک مستک پر

وہی کچھ قدر سمجھے گا مری فرسودہ بالی کی
طپش سے گھِس گئے جس مرغ کے آپس میں لگ لگ پر

ہزاروں کینے قائمؔ، مہر میں گردوں کی پنہاں ہیں
نہ کیجو اعتماد اے سادہ دل زنہار اس ٹھگ پر

برہم تو نہیں زلفِ گرہ گیر ہوا پر — کیوں موجِ ہوا آج ہے زنجیر ہوا پر
کی کس کی نگاہوں نے یہ تاثیر ہوا پر — چلتی ہے جو یہ برق سی شمشیر ہوا پر
جی میں ہے میاں، آج نگہ کی تری تڑپھن — کیجے قلمِ برق سے تحریر ہوا پر
مت قصر کو ہستی کے کھڑا دیکھ کہ غافل — مانندِ حباب اس کی ہے تعمیر ہوا پر
کب بند ہوں نیرنگِ تعلق[1] میں سبک روح — کھنچتی ہے کوئی رنگ سے تصویر ہوا پر
آخر ہے وہی خاک میں آرام گہ اے شیخ — کس کام، جو اُڑتا ہے تو جوں تیر ہوا پر
پوچھیں گے سلیماں سے کہ کیدھر کیا برباد — وہ تخت، جو چلتا تھا یہ توقیر ہوا پر
زلفیں تری الجھے ہیں یوہیں بادسے پیارے — ثابت تو سرِ مو نہیں تقصیر ہوا پر
قائمؔ، میں جھپٹ کیا کہوں اُس تیرِ نگہ کی
ہلنے نہ دے اُڑتا ہو جو نخچیر ہوا پر

---

شب کہا میں، ترے کوچے میں نہ رہنا بہتر — ایسے کہنے سے تو البتہ نہ کہنا بہتر
اشک کا ضبط کروں کیوں کہ، ابھی عشق ہے خام — تازہ ناسور کا مُندنے سے ہے بہنا بہتر
سالکِ عشق کو لازم ہے کرے ترکِ قیود — جو شناور ہے، اگر ہو وہ برہنا بہتر
دستِ گل خوردہ مرا، کیوں نہ حمائل کیجے — کہ ہے پھولوں کی تو نسبت سے یہ گہنا بہتر
قائمؔ، آمان، جفائیں نہ اُٹھا خوباں کی
اپنی ذی پر نہیں اِن باتوں کا سہنا بہتر (کذا)

---

آجکل پھر موسمِ گل کے ہے آنے کی خبر — لے، اگر لینی ہے تو اپنے دوانے کی خبر
پہنچتی نہیں بازبھی زنداں تلک اپنے تو آہ — کس سے پوچھیں یاں ہم اپنے آشیانے کی خبر
ہے یہ سب مرغِ چمن سرگرمِ فکرِ آشیاں — نہیں سُنی گویا کہ اِن نے گُل کے جانے کی خبر

---

[1] مخطوطے میں یہ لفظ کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے کہ اس کو "تعیّن" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

گر زمانے کو خبر نہیں حال کی اپنے، تو کیا — نہیں نہیں بھی حال میں اپنے زمانے کی خبر

ہوں اسیر اس طفلِ بے پروا کا میں قائمؔ، کہ پھیر
قید کر کر لی نہ جن نے آب و دانے کی خبر

---

بے شغل نہ زندگی بسر کر — گر اشک نہیں تو آہ سر کر
دے طولِ امل نہ وقتِ پیری — ہوئی صبح، فسانہ مختصر کر
کچھ طُرفہ مرض ہے زندگی بھی — اس سے جو کوئی چھٹا تو مر کر
کعبے کے سفر میں کیا ہے زاہد — بن جائے تو آپ سے سفر کر
کیا دیکھے ہے آئینے کو پیارے — ایدھر بھی تو ایک دم نظر کر
وہ باعثِ زیست شاید آجائے — اے جان، تو جا یئو ٹھہر کر
فرصت ہے غنیمت آج غافل — جو ہو سکے نفع یا ضرر کر
یہ دہر ہے کارگاہِ مینا — جو پانو رکھے تو یاں، سو ڈر کر

تعمیر پہ گھر کی مر نہ اے دل
قائمؔ کی طرح دلوں میں گھر کر

---

گو کرے ہم کو کسی طرح تو در سے باہر — جیتے جی جائیں کوئی ہم ترے گھر سے باہر
تم کو کیا قدر ہے اے دیدہ مرے رونے کی — ایک بوند آئے ہے سو خونِ جگر سے باہر
تھی تو اک بات، پہ کیا کہیے کہ یاں تو پیارے — نکلی ہی پڑتی ہے تلوار کمر سے باہر
دے کے دُھتے مجھے، ہر وقت نکل جاتے تھے — دل میں اب آئے ہو، جاؤ گے کدھر سے باہر
بہتے دیکھا نہیں یاروں نے لہو کا سیلاب — رکھ ٹک اے اشک قدم دیدۂ تر سے باہر

---

سلام، شب تھوڑی ہے قصہ مختصر کر

نالہ رکتا تو ہیں، لیکن یہی ڈر ہے، جوں شمع  ہو نہ یہ شعلہ کہیں پھوٹ کے سر سے باہر
سو جتن کر، کہیں ممسک سے لگے ہے کچھ ہاتھ  ایک قطرہ کوئی کاڑھے تو گہر سے باہر
بل بے زہرہ، کہ میں سنمکھ ہوں نگہ سے تیری  ہے یہ وہ تیر، ہو نوہے کی سپر سے باہر
ایک سوداؔ کی تو قائم نہ کہوں میں، ورنہ
ہے ترا طورِ سخن حدِّ بشر سے باہر

---

بھلا اے ابرِ مژگاں، ٹک تو بس کر  ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر
نہیں کہتا میں دل، ترکِ تمنا  پہ جتنی ہو سکے اتنی ہوس کر
لبوں پر آ رہی ہے جانِ صیاد  نہ لے جنگل میں ظالم مجھ کو کس کر
ملے بس قافلے کو ہم سے بہکے  عبث مت شور لے بانگِ جرس کر
فریبِ باغباں پر ہو کے غافل  نہ اے بلبل، اکٹھے خار و خس کر
زہے پرداخت تیری اے صیاد  موئے ہم آب و دانے کو ترس کر
بہارِ عمر ہے قائم کوئی دن
اسے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر

---

حرفِ کفر و دیں پہ ہے کیا منحصر  ہاں دلا! خُذ ما صفا، دَع ما کدِر
گردشِ گردوں سے ہر ثابت، کہ یاں  اتنا[1] ہی سر درد ہے جتنا کہ سر
خیر و شر کو تو سمجھ ناداں کہ آب  خاک کو نافع ہے، آتش کو مضر
ہو نہ زاہد منکرِ اعمالِ خلق  اُس کی رحمت کا اگر ہے تو مُقِر
فیضِ حق آتے ہیں پے در پے چلے  بیٹھ تو یک دم تو غافل منتظر
کو مصادم تا وہ دیں دل کو شکست  ہم سنا ہے، عندَ قلبِ مُنکسِر

---

[1] مخطوطے میں "اتنی ہی سر درد"

چاہے قائمؔ جام، تو حافظ کی طرح
کہہ، اَلاَ یَا اَیُّہَا السَّاقِی اَدِرْ

---

دل میں اپنے نہیں کوئی جز یار
لَیْسَ فِی الدَّارِ غَیْرُہٗ دَیَّارْ
کفر و دیں سے نہیں کچھ آپ کو بحث
سرِ تسبیح و گردنِ زُنّار
داغِ اشک آستیں سے اُڑتے ہیں
مفت جاتی ہے ہاتھ سے یہ بہار
ہم وہ آفت طلب ہیں، ہے جن کو
زخمِ شمشیر، مرہمِ زنگار
یاد میں کس کی رات رویا ہوں
غرقِ خوں ہے ہنوز جیب و کنار
آہ کیا کیجے، زلف و رُخ اُس کا
چت چڑھا ہی رہے ہے لیل و نہار
ناصحا، ترک کیجے کس کس کا
جیتے جی کو تو سب کچھ ہے درکار
عشق بازی کو کیا کرے گا تو
گو کہ چھوڑا میں اک شرابِ قمار
ہم نے دیکھا ہے داغِ دل قائمؔ
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارْ

---

مفت ہے یہ دید پیارے یک نظر
پھر کہاں اک دم میں تو، اور ہم کدھر
کیو(ں) نہ جی گھبرائے زیرِ آسماں
گھر تو ہے مطبوع، پر بس مختصر

---

واقف نہیں ہم کہ کیا ہے بہتر
جز یہ کہ تری رضا ہے بہتر
دیتا ہے وہی طبیبِ حاذق
بیمار کو جو دوا ہے بہتر
کس سے کہوں حالِ بد، کہ وہ آپ
کچھ مجھ سے بھی جانتا ہے بہتر
آئینہ ہو، یا تو آب، لیکن
ہر شکل میں اک صفا ہے بہتر

چربے سے اگر ہو صحبتِ غم　　شادی سے ہزار جا ہے بہتر
لے نالہ خبر، کہ زخمِ دل کا　　پھر، کہتے ہیں، ہو چلا ہے بہتر
ہر عضو ہے دل فریب تیرا　　کہیے کسے کون سا ہے بہتر
جاتی ہے نسیم اُس گلی کو　　اُٹھ سکیے تو قافلا ہے بہتر

قائمؔ، جو کہیں ہیں فارسی یار
اُس سے تو یہ ریختا ہے بہتر

---

دوزخ بھی کیا ہے چشم کے خوناب کے حضور　　پانی بھرے ہے آگ تو اِس آب کے حضور
اُٹھی نہ آنکھ خط میں، تری چشم دیکھ کر　　سبزی پیے ہے کون مے ناب کے حضور
سُو جائے منہ لپیٹ کے جو یاد میں تری　　سو جاگنے خفیف ہیں اُس خواب کے حضور
کٹتی ہے زلف رو سے ترے یوں کہ جس طرح　　آوے فقیر صاحبِ اسباب کے حضور
تڑپھوں سے اُس نگاہ کے دل کو پڑا ہے کام　　ٹھہرے نہ برق جس کی تب و تاب کے حضور
دستِ تہی ہے مانعِ دیدارِ دوستاں　　کیا[1] جاؤں اِس طرح سے میں احباب کے حضور

مانوں گا شاعری کو میں قائمؔ تبھی تری
سرسبز یہ غزل ہو جو نوّاب کے حضور

---

تھی وفا اُس مرتبہ، یا بے وفائی اِس قدر　　آشنائی اُس قدر، نا آشنائی اِس قدر

---

[1] م: کیا جائیے اس آن سے احباب کے حضور

# ز

نخلِ امید کیونکے ہمارا ہو آہ سبز
اس باغ میں کبھو نہ ہوا برگِ کاہ سبز

بو دیں کسو (ہی) طرح سے ہم تخمِ آرزو
ہونے کبھو نہ دے فلکِ روسیاہ سبز

ہوئے نہ شام، زلف کے آگے تری سفید
ہر گز نہ سامنے ہو ترے رُخ کے، ماہ سبز

آغاز خط کا ہے ترے عارض پہ معجزہ
شعلے کے یاں جگر سے ہوا ہی گیاہ سبز

ایسی بھی ہے سر پہ ہمارے کلاہِ فقر
جس کے حضور ہو نہ سکے تاجِ شاہ سبز

طاعت کا شیخِ شہر کی میں کیا بیاں کروں
شیطاں کا جس کے آگے نہ ہووے گناہ سبز

مزرع مرے کو خشک سحابِ کرم نہ دیکھ
پل مارتے کرے ہے تری اک نگاہ سبز

روتے گئے گلی سے تری بس کہ اہلِ دل
ہے اُن کے فیضِ چشم سے ہر خارِ راہ سبز

قائمؔ تو دردِ دل سے نہایت ہے بے قرار
ہوتا ہے گہ سفید ترا رنگ گاہ سبز

---

آمادۂ خلش ہیں مرے عضوِ تن ہنوز
کاوش طلب ہیں تیغ سے زخمِ کہن ہنوز

یک دم تو مجھ کو چین دے گل چینِ روزگار
دیکھا نہیں میں سیر ہو روے چمن ہنوز

ہو ہے غریبِ یک دو جہاں بیش تر، کہ آہ
جاتی نہیں ہے دل سے ہوائے وطن ہنوز

دامن نہ کھینچ خاک سے میری تو شعلہ خو
پر بے قرار ہے ہوسِ سوختن ہنوز

یک صبح تو گیا تھا کہیں باغ میں سو آہ
تڑپیں ہیں خاک و خوں میں گل و یاسمن ہنوز

سر تا قدم ہوا میں دہن، پر بسانِ نے
وابستہ تجھ لباں سے ہے میرا سخن ہنوز

قائمؔ نہ مجھ مزار پہ روتی ہے ایک شمع
کرتے ہیں چاک گل بھی پڑے پیرہن ہنوز

---

آنکھیں تو جو پڑی ہیں مژہ خوں چکاں ہنوز
چھت بہ گئی، پہ جاری ہیں یہ ناوداں ہنوز
خط آچکا پہ مجھ سے تو ہے بدگماں ہنوز
نا مہرباں ہے کس لیے اے نامہرباں ہنوز
یک خلق سے ہیں جس کے لیے دشمنی کی نیت
کرتا ہے دوستی کو مری امتحاں ہنوز
صد برگ کی طرح میں شگفتہ ہوا تو کیا
سو خارِ غم ہیں سینے میں میرے نہاں ہنوز
گزری اک عمر گرچہ قفس میں ہمیں پہ ہے
جی میں وہی ہوائے گل و گلستاں ہنوز
گو خاک میں جفا سے میں اس کی ملا پہ آہ
درپے ہے دشمنی کے مری آسماں ہنوز
جو وقت پر اٹھے تھے سو منزل پہنچ چکے
ویسا ہی خواب میں ہے مرا کارواں ہنوز
پھرتا نہیں ہے آکے مری لاش پر وہ شوخ
حیلوں سے کس قدر ہے مرے بدگماں ہنوز
انکارِ بوسہ گو کہ تو قائم کیا، تو کیا
ہونٹھوں سے لگ رہا ہے ترے رنگِ پاں ہنوز

---

میں ہوں اسیر، پہ کرتا ہوں سیرِ باغ ہنوز
نیا ہی ایک اُبلتا ہے دل سے داغ ہنوز

شمیمِ زلف کا کس کی چمن میں تھا مذکور
نسیم، بنکہتِ گل سے ہے بیدماغ ہنوز

ملا میں خاک میں، تس پر نصیب کی خوبی
ہے جو بلا، سو وہ لے ہے مرا سراغ ہنوز

نہ لائے گورِ غریباں پہ گو کہ شمع کوئی
ہے داغِ سر سے سرہانے مرے چراغ ہنوز

میں بعدِ مرگ بھی قائمؔ چھٹا نہ گردش سے
ہے میری خاک سے اس بزم میں ایاغ ہنوز

# س

صحبت کا جی میں چاؤ، نہ آزار کی ہوس — ناگفتنی ہے کچھ مرے بیمار کی ہوس
جھانکیں بھی گر نہ چاکِ قفس سے تو کیا کریں — کیوں ہے تو نکلے تیرے گرفتار کی ہوس ذکلا
طوبیٰ کی چھاؤں تجھ کو مبارک ہو زاہدا — ہے اپنے دل میں سایۂ دیوار کی ہوس
کہہ عندلیب، گل نے جو پھاڑا ہے پیرہن — رکھتا ہے کس کے گوشۂ دستار کی ہوس

قائمؔ تو دیکھ تیغ بکف اس کو[1] منہ نہ موڑ
مدت میں نکلی ہے دل افگار کی ہوس

---

نہ کلہ کا جی میں یاں خطرہ، نہ افسر کی ہوس
دین و دنیا سے کچھ ادھر ہے قلندر کی ہوس
راکھ ماٹی میں ملے رہتا ہے جلتوں کو سکوں
غیر خاکستر کے کیا ہے اور اخگر کی ہوس
قدر سمجھے گا وہی حسرت کی میری باغباں
جی کی جی میں رہ گئی جس مرغِ بے پر کی ہوس
آتشِ غم چاہیے یاں خاک کرنے کے لیے
ہوئے گی اہلِ ہوا کو آبِ کوثر کی ہوس
خون اپنا طائرِ گم کردہ گلشن میں کہاں
ذبح میں اپنے نہ نکلی اس کے خنجر کی ہوس
ہم تہی دستوں سے کب خوباں کی صحبت ہو برآر
زر کی خواہش ہے انھیں اور زیب و زیور کی ہوس

---

[1] مخطوطے میں "اس کی"

کیونکے ہم قائم کریں کونین تک گردوں سے صلح۔
ربع مسکوں پہ نہ نکلی جب سکندر کی ہوس

---

بیٹھیے کوئی روز دل کے پاس — بس[1] بہت باندھے ہم پتال و اکاس
نت ششش و پنج میں رکھا مجھ کو — جائے اِن نُہ فلک کا ستیاناس
دے تو تغیّرِ حال اب کہ یہی (کذا) — کام اپنا تو تھا تغیّرِ لباس
سبز ہو خاک سے میں کھینچوں سر — تیغ تیری بنے جو ٹوٹ کے داس
وجہِ ناکامی ایک ہو تو کہوں — غیرت و عشق و غربت و افلاس
تا چمن سے تو بے نقاب گیا — لگے ہے رنگِ گل نظر میں اداس

حال دل کا نہ پوچھ کچھ قائم
آئے ہے اب تو آپ کو بھی ہراس

---

گو یاں نہ کسی کو آئے افسوس — حالت تو ہے اپنی جائے افسوس
دیتے تو دیا میں دل کو لیکن — چارہ نہیں اب سوائے افسوس
ہوں کشتہ میں واں کہ جس جگہ میں — کوئی نہ کسی پہ کھائے افسوس
جوں شمع اگر نہ سر دھنوں میں — کیا کام کروں ورائے افسوس
چلتے ہوئے اہل بزم نے یاں — چھوڑا ہے مجھے برائے افسوس
قائم وہ عمل کہ بعد تیرے — اک خلق کہے کہ ہائے افسوس

---

گاہ اے ابر مژہ گھر آ تو اور گاہے برس
یاں کئی طوفاں ہے خرمن جس قدر چاہے برس

---

[1] م: ہم نے باندھا بہت

# ش

یاں چشم تمام آب ہیں سارا جگر آتش — دل جائے سو کیدھر، ادھر آب و ادھر آتش
کیا جنسِ فاجل کے نہ سینے میں ہوئیں خاک — اُس گھر کی طرح جس گھر کو لگے بے خبر آتش
بیتابی کو فرقے کی ہو واں کون سی ارزش — پھر آپ کو گنتا ہے جہاں نعل در آتش
یہ دل ہے مرا، وادیِ ایمن نہ ہو موسیٰ — جرأت سے طلب کیجو نہ یاں آن کر آتش
اُس چہرۂ روشن سے نہ دے شمع کو تشبیہ — پہنچے ہے کوئی طور کے شعلے کو ہر آتش
[له] کیا کم ہے یہ دوزخ سے کہ جنت میں کوئی جائے — مانا بہ تفِ دل ہے جہنم کی گر آتش

گستاخ نہ ہو خاک نشینوں سے کہ قائم
دیکھی ہے چھپی راکھ میں ہم بیشتر آتش

---

جاتے جاتے جائے گا پھر وہ یہ سینے کا خراش
ایک دن میں کیوں کے ہو چنگا سینے کا خراش
جاں کنی کر عشق میں، شہرت اگر مقصود ہے
نامور کرتا ہے خاتم کو نگینے کا خراش
اُس نگاہِ بادہ پیما سے، دلا گرمی نہ کر
مار ڈالے ہے شرابِ تند پینے کا خراش
دکھ کہوں یاروں کا، یا اغیار کی پیارے خلش
دل کو برماتا نہیں یاں کس کے کینے کا خراش

---

له یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

ہائے یہ مانگے ہے بوسہ کس سے تو قائم کہ یاں
رنجہ اُس عارض کو کرتا ہے پسینے کا خراش

---

کسو کے ہوگی دلِ غم برشت میں آتش
رکھی ہے شعلہ صفت یہاں سرشت میں آتش
لچک ہے چال کی کس شعلہ قد کی مدنظر
کہ پوجتا ہے برہمن کنشت میں آتش
کہاں وہ برق ، جو خرمن کو پھونک دے میرے
کہ اب کے سال نہیں دی میں کشت میں آتش
شرابِ دولتِ دنیا ہے گرچہ صورتِ آب
چھپی ہے لیک تمام اس بلشت میں آتش
ہوا نہ داغ چھٹ اپنے نصیب کچھ جوں شمع
لگے خدا کرے اس سرنوشت میں آتش
نہ حرفِ طور و تجلی پہ گوش رکھ کہ وہی
عیاں ہے اب بھی ہر اک سنگ خشت میں آتش
گدا و شاہ برابر ہیں عشق سرکش کو
تمیز کرتی ہے کب خوب و زشت میں آتش
جو سوزِ عشق کا چرچا ہی واں نہیں قائم
تو کیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش

---

پی کے مے، غیر کے رہے شب باش — واہ وا، رحمت، آفریں، شاباش
سینہ کاوی ہے کام ہی کچھ اور — کوہکن بود مرد سنگ تراش
تجھ سے صحبت بنے سو کیونکے مجھے — میں تو اپنے غریب تو اوباش (کذا)
محتسب کیونکے مے کو دیکھ سکے — خوش ہے کب آفتاب سے خفاش
جاے اجرت نہ لے خوں بہا پہلے — اس پتے پر پہنچ تو غیر تلاش
گھر ہے اس جنگجو کا واں قاصد — پڑی ہیں جس گلی میں لاش پہ لاش

خوب رو ہیں سو زر طلب قائم
وائے بر عاشقے کہ ہو قلاش

دیکھا ہے آج راہ میں ہم اک حریر پوش
پر یار کچھ نہ پوچھ کہ کیا چھب، چہ بر، چہ دوش
پیٹوں ہوں کس کے غم میں سر و سینہ میں کہ آج
ہو ہے یہ شش جہت سے تقاضا، کہ ہاں بجوش
سجدہ ہو آستانِ حرم کا نصیبِ شیخ
میں اور سو نیاز و درِ پیرِ میفروش
فریاد تیں سنی نہ مری، ورنہ گل تمام
سننے کو نالہ مرغِ چمن کا، ہوا ہے گوش

قائم ہے کیا ہلاہل و آبِ خضر پہ حصر
آجائے بزمِ دوست میں جو کچھ، سو کیجے نوش

---

# ص

دلا اُس آفتِ جاں سے تو کہہ تو کیا اخلاص
جو دشمنی سے سمجھتا نہیں ہے تا اخلاص
نگو نہیں شکل تو ہے گل کی لیک خوب نہیں (کذا)
کسی زمانے میں بلبل سے ہم کو تھا اخلاص
کہاں وہ صبر کہ ملیے نہ یاں تلک اس سے
کہ ترک محض ہی آجائے ہوئے یا اخلاص
بہت نباہی محبت میں ویسے، لیکن آہ
جو ہوئے دشمن جاں اس سے تا کجا اخلاص
نہ ہو تو غرّہ کہ زاہد نہ جانے واں مقبول
ترا یہ طاعت و تقویٰ ہے یا مرا اخلاص
یہ دل ہے، مفت تو پیارے دیا نہیں جاتا
میں کچھ تو دیکھ لوں شفقت، کرم، وفا، اخلاص
نہ دیجو ہاتھ سے اے پیرِ دیر قائمؔ کو
کہ پھر نہ پائے گا ایسا مرید با اخلاص

---

کیوں تو صیّاد کیا ہم کو گرفتارِ قفس — ہم نہ شایستۂ بسمل، نہ سزاوارِ قفس
جس گھڑی کرتے تھے سودائے چمن بلبل سے — ہم زرِ داغِ جگر سے تھے خریدارِ قفس

---

# ض

دکھتا ہے جو تو صفائے عارض — موتی نے کہاں یہ پائے عارض
آک صافیِ تن ہے گل میں بھی لیک — ایسا وہ کہاں سے لائے عارض
اس سینے سے منہ رگڑ نہ لے داغ — اُس کی نہتی کبھو یہ جائے عارض
کس سے کہوں اس کے منہ کا نقشا — اے وائے جبین و ہائے عارض
درخور نہیں اُس کے نسبتِ ماہ — رکھتا ہے یہ اک ضیائے عارض
بیجانے میں مہر و ماہ دیبجے — تیرا ہو جہاں بہائے عارض

کیا دور، جو حشر ہوئے قائم
کھ پاٹ وہ جب دکھائے عارض

---

دیکھی ہیں، ترے چشم کے بیمار کی، شب نبض — کچھ گرمیِ دل سے تھی تو اتر میں عجب نبض
آمان طبیب، اِس پہ نہ رکھ ہاتھ، کہ ابھی — مانا بہ رگِ برق ہے، گرمی کے سبب نبض
اڑنے سے شرر سکے، ہو رگِ سنگ میں کر فرق — تڑپے نہ گراں باروں کی ہنگام غضب نبض
دیکھو ہاتھ سے دھڑکا تو مرے دل کا کہ ظالم — کرتا ہے کوئی عشق کے ماروں کی طلب نبض

گو عشق کا اخفا تو کرے ہم سے پہ قائم
چھپتی ہے اس آزار کے بیمار کی کب نبض

---

جی نکلنا تھا ہمیں یارب غرض — لیک کیا جانے یہ نکلے کب غرض
تجھ سے ظالم کو کوئی دل دے سو کیوں — فایدہ، حاصل، جہت، مطلب، غرض

---

# ط

تھا وہ بیگانہ، کیا یاں ہم نے جس سے اختلاط
گر یہی شکلِ جہاں ہے، کیجے کس سے اختلاط

کیمیا ہے ناقصوں کو، خاکساروں کا ملاپ
ہوئے ہے سونا، جو ہو اکسیر و مس سے اختلاط

خشکیِ تن نے تری زاہد، بھلی رکھ لی ہے شرم
کون کرتا ورنہ یاں تجھ سے نجس سے اختلاط

اے وفا بیگانہ، ملنے میں ترے حاصل ہے کیا
بے وفا تجھ سا جو ہو کیا کیجے دِس سے اختلاط

جی دیا قائمؔ نے تیں مل کر کے اُس بانکے کے ساتھ
ہم نہ کہتے تھے کہ ناداں کر نہ بیں سے اختلاط

---

اِس کو نہ راست کہہ تو، نہ اُس کو بتا غلط — کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط
دیکھا ہے میں رباعیِ ہستی کو غور سے — پر لفظ نادرست ہیں، حد مدعا غلط
اظہارِ عشق، ڈول ہی اپنا نہیں ہے شوخ — جن نے کہا یہ تجھ سے، ہے محض افترا غلط
اس مارِ پیچ کوچے میں کاکل کے، دل ہو گم — جس میں کہ راہ، خضر نے اکثر کیا غلط

قائمؔ، نہ عیشِ نقد کو نسیے پہ چھوڑیے
کیا جانے بات قصے کی ہے راست یا غلط

---

چوری نہ کی، جو تجھ سے کیا بھی ہم اختلاط — باہم دگر رکھے ہے میاں عالم اختلاط

یہ رسمِ انتقام ہے کس ملک کی کہ شوخ     صد عمرِ خضر بے مزگی، یکدم اختلاط
موتی کا تیرے گوش سے دیکھے اگر وہ ربط     گل سے کرے نہ بھول کے پھر شبنم اختلاط
جس تس طرح یہ آگ دبائی ہے میں ابھی     پھر داغِ دل سے کر نہ تو اے مرہم اختلاط

قائمؔ نہیں ہے ملنے میں خوباں کے آبرو
لازم ہے یہ کہ ان سے کرے تو کم اختلاط

---

بھوکے کو کب ہو کاسۂ دا ژ دل سے انبساط
یعنی طمع نہ رکھ فلکِ دوں سے انبساط
ما سندِ غنچہ، موجبِ آشفتگی ہوا
پہنچا کسی کے دل کو جو گردوں سے انبساط
دیکھی تھی بس کہ رات حنا بندیِ مژہ
ٹپکا پڑے ہے دیدۂ پر خوں سے انبساط
فیضِ ہوا سے بس کہ رطوبت کی صرفِ خاک
اگتا ہے جائے گل دلِ ہاموں سے انبساط

قائمؔ کو تیرے قد سے خوشی کیوں نہ ہو کہ ہے
شاعر کے دل کو مصرعِ موزوں سے انبساط

---

# ظ

بِن ترے لالہ زار سے کیا حظ — سیرِ باغ و بہار سے کیا حظ
تو ہی ساقی اگر نہیں تو ہمیں — بادۂ خوشگوار سے کیا حظ
چشم اس گل سے دور ہیں کس کا (کتا) — بے چمن، آبشار سے کیا حظ
وعدہ جھوٹھا بھی وہ نہیں کرتا — بس ہمیں انتظار سے کیا حظ
آنسو پونچھے نہ آستیں جو تری — دیدۂ اشکبار سے کیا حظ
مانگتے بوسہ، تو کرے ہے کنار — ایسے بوس و کنار سے کیا حظ

بد ہیں اپنے نصیب اگر قائمؔ
خوبیِ روزگار سے کیا حظ

---

کیا[1] ہے وضعِ جہاں نے تو دل کو بس محظوظ
کہ لاکھ، جی سے ہیں عاجز، اگر ہیں دس محظوظ
ہمیشہ دستِ تاسّف ملے ہے وہ، جس کو
کرے ہے چاشنیِ دہر جوں مگس محظوظ

---

[1] یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

# ع

یوں جلے آہ پتنگے سا تماشائیِ شمع
آگ لگیو تجھے اے انجمن آرائیِ شمع

راز دلِ سوختگاں کیونکے چھپائے سے چھپے
ہوتی ہے پردۂ فانوس سے رسوائیِ شمع

شکرِ بےتابیِ پروانہ کرے کون کہ یاں
آپ ہی رشتے میں ہے پنجۂ گیرائیِ شمع

شیخ جی، رات اندھیری میں تم آئے ہو یہاں
آپ کے واسطے گر امر ہو منگوائیے شمع

آہ پروانے کو تو کچھ نہ سمجھا یا قائمؔ
مایہ گو خلق کی نظروں کا ہو بینائیِ شمع

---

گو بنام اک زبان رکھتی ہے شمع
کب ترا سا بیان رکھتی ہے شمع

تیرے مکھڑے کا سا نمک معلوم
ایک پھیکی سی آن رکھتی ہے شمع

سرفروشی کے مخترع ہم ہیں
گو اب اونچی دکان رکھتی ہے شمع

داغ پر داغ اٹھائے دل کی طرح
کب یہ تاب و توان رکھتی ہے شمع

روئے گو تو وہ تو وہ، کب ایسے
دیدۂ خوں فشان رکھتی ہے شمع

آہ اس داغِ دل سے، جس کے کہ دست
نت سوئے آسمان رکھتی ہے شمع

کیوں نہ پروانہ رشک سے نہ جلے
سب کے آگے فلان رکھتی ہے شمع

کھول مکھڑا کہ ہے یہ مجھ کو یقین
تجھ سے دعویٰ گمان رکھتی ہے شمع

یہ دلِ افسردہ، وائے قسمتِ بد
سوز تا استخوان رکھتی ہے شمع

راتوں جاگی مثلِ قائمؔ کے
تب یہ سوزِ بیان رکھتی ہے شمع

آگ ہر چند کہ سینہ میں طپاں[1] رکھتی ہے شمع
لیک جل بجھنے کے سب ڈھنگ کہاں رکھتی ہے شمع

گو یہ بھڑکے ہے اُسے دیکھ، پہ جی میں تو وہی
رشتۂ الفتِ پروانہ نہاں رکھتی ہے شمع

جل بجھے ہم پہ کبھو دم نہ نکالا منہ سے
ایک ذرا داغ پہ کیا سوز و فغاں رکھتی ہے شمع

ایک عاشق پہ ترا جی ہی نہ پگلا، ورنہ
غم میں پروانے کے نت اشک رواں رکھتی ہے شمع

دو دو انجھر میں وہ کچھ اور ...... قائم
کیا ہوا یوں جو سوا گز کی زباں رکھتی ہے شمع

---

آتشِ تب نے کی ہے تاب شروع — تو بھی کر دیدۂ پُر آب شروع
کیوں نہ ابتر ہو آنسوؤں سے چشم — کی ہے لڑکوں نے یہ کتاب شروع
شب میں چاہا کروں کچھ اُس سے سوال — بن سُنے ہی کیا جواب شروع
سرفۂ خشک بھی ہے اک حیلہ — کرنی زاہد کو تھی شراب شروع

نام سنتے ہی اس کا بس قائم
پھر کیا تو نے اضطراب شروع

---

[1] مخلوطے میں یہ غزل حاشیے پر درج ہے۔ یہ لفظ کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے کہ اس کو "عیاں" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

# غ

تیر مژہ کھائے اک ابرو کی سہے تیغ — یاں تو یہی آفت ہے، گہے تیر و گہے تیغ
گریے سے ہو کیوں نہ وہ خونخوار مکدر — بندھ جائے ہے زنگار، جو نم بیچ رہے تیغ
یک پل میں ترے غمزے نے مارا دو جہاں کو — اس بجلی کے ٹکڑے کو کوئی کیونکے کہے تیغ
دل کیوں نہ ڈرے سینۂ مجروح میں تنہا — وہ کھیت نپٹ سخت ہے جس میں کہ بہے تیغ
ہو کوئی لطف سے صحبت کے کب آگاہ — جوں شمع جو کچھ عمر کٹی یاں سو تہِ تیغ

---

جاں بلب ہے نالہ کھاؤں کیوں نہ میں سینے میں داغ
نزع میں رنجور کی بالیں پہ لازم ہے چراغ
ہو کیو(ں) نہ آنسو، شعلہ زن جب تک ہو داغ
دست و پا مارے ہے لڑکا دیکھ کر روشن چراغ
ل شیشۂ عشرت پہ کیجو اے سپہر
لیک دے اتنی تو فرصت بھر لے میرا بھی ایاغ
چمن میں دیکھیے کیونکر بسر ہو اے نسیم
ہے مزاجِ نکہتِ گل شوخ، اور ہم بے دماغ
ساقی کہاں، اب جام اور مینا کدھر
وں میں تا مستی میں گلشن کا حریفوں سے سراغ
چلے اے باغباں گو تنگ ہو تجھ سے دنیک
غنچۂ دل کو ہو بلبل کے بحقِ گل فراغ

ہم اسیروں کو نہ کر تکلیفِ گلگشت اے نسیم
کون سی باقی ہے اب دل میں ہواے سیرِ باغ
جیتے جی قائمؔ کے، ہو کیوں کر سخن یاروں کا سبز
آگے طوطی کے خوش آتی ہے کسے فریادِ زاغ

---

بس نہیں اب دل پہ میرے جاے داغ — دے نہ لے غم داغ بر بالاے داغ
خوں ہوا دل غنچۂ لالہ کی طرح — تا کجا کرتا رہوں اخفاے داغ
موجِ آتش کیو(ں) نہ پہنچے عرش تک — دل سے اٹھا ہے مگر دریاے داغ
کیا کہوں دوری میں تیری کیا الم — دیکھتی ہے چشمِ نابیناے داغ
دل ہے قائمؔ رشکِ صد سروِ چراغ
ہجر میں اس گل کے از بس کھائے داغ

---

[1] افتادگانِ رہ سے طلبِ دل کا کر سراغ — نقشِ قدم سے ڈھونڈھ کے پالے ہیں ہر سراغ
[2] چشم و نگاہ و زلف و خط و خال اس طرف — کھویا گیا ہوں ........ سراغ

---

[1-2] یہ شعر ل، میں نہیں ہیں۔

# ف

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف ‌ ‌ ‌ اشفاق، عنایات، کرم، مہر، تلطف
اے گریہ، پسِ قافلہ دل نام ہو اک یار ‌ ‌ ‌ یہ خستہ بھی نیمہ جائے، جو یکدم ہو توقف
ہے ڈول تو نالے کا وہی، دل بھی وہی ایک ‌ ‌ ‌ تاثیر نہ اب اس میں ہے، نے اُس میں تصرف
صوفی ہے وہ، بے علم ہو جو ہستی سے اپنی ‌ ‌ ‌ کس کام، پڑھا تو نے جو یوں علمِ تصوف
خاموشی بھی کچھ طرفہ لطیفہ ہے کہ قائمؔ
کرنا پڑے جس میں نہ تصنع نہ تکلف

---

دیکھے ہو کے ٹک تو بارے اے خونخوار یکطرف[۱] ‌ ‌ ‌ میں آج یک طرف ہوں، ترے یار یک طرف
انصاف ہے کہ غیر سے صحبت رکھے تو گرم ‌ ‌ ‌ بیٹھا رہوں میں مثلِ گنہ گار یک طرف
سیکھے ہو کس سے سچ کہو پیارے یہ چال ڈھال ‌ ‌ ‌ تم یک طرف چلو ہو، تو تلوار یک طرف
ناز و کرشمہ عشوہ و انداز اور ادا ‌ ‌ ‌ میں یک طرف ہوں، اتنے ستم گار یک طرف
کس بات پر تری میں کروں اعتبار ہائے ‌ ‌ ‌ اقرار یک طرف ہے تو انکار یک طرف
دیکھیں پہ وے کون بھلا سالکِ بختِ دل ‌ ‌ ‌ میں یک طرف ہوں، ابرِ گہر بار یک طرف
قائمؔ ہر ایک کوچے میں ہے طرفہ تعزیہ ‌ ‌ ‌ یوسف ترے کی گرمیِ بازار یک طرف
دلال ایک سمت کو منہ سے ملیں ہیں خاک
سر پیٹتے پھریں ہیں خریدار یک طرف

---

۱؎ م، "کر امتحاں ٹک ہو کے تو خونخوار یک طرف" ۔ ل، میں متن میں یہی مصرع ہے لیکن اس پر لفظ "بدل" لکھ کر حاشیے میں یہ مصرع لکھا ہوا ہے۔

دیکھا کبھو نہ اس دلِ ناشاد کی طرف — کرتا رہا تو اپنی ہی بیداد کی طرف
جس گل نے سن کے نالۂ بلبل اُڑا دیا — رکھتا ہے گوش کب مری فریاد کی طرف
موند اے پرِ شکستہ نہ چاکِ قفس، کہ ہم — ٹک یاں کو دیکھ لیتے ہیں صیاد کی طرف (کذا)
کہتے ہیں، گریہ خانۂ دل کر چکا خراب — آتا ہے چشم اب تری بنیاد کی طرف
خسرو سے کچھ بگاڑ ہے شیریں کا ظاہرا — پیغام پھیر جاتے ہیں فرہاد کی طرف
لیجو[1] خبر مرے بھی دلِ زار کی نسیم — جاوے اگر تو اس ستم آباد کی طرف

قائمؔ تو اس غزل کو یوں ہیں سرسری[2] ہی کہہ
ہونا پڑے گا حضرتِ اُستاد کی طرف

---

اگرچہ داغ ہیں لالے کے دل میں چار طرف — نہ یہ ستم کہ جلا یاں جگر ہزار طرف
اجڑ نہ جائے جو تختہ وہ داغِ دل کا میاں — تو کیا جگر سے ہمارے ہو لالہ زار طرف
اُدھر وہ غیرت کی حشمت، اِدھر یہ حج ہے نقط — جو چاہو ان سے سو کر لو اک اختیار طرف
ڈہا کھڑا ہے ہزاروں جگہ سے قصرِ وجود — بتاؤں کون سی اس کی میں استوار طرف
طرف نے بند کیا ہے ہر اک طرف سے تجھے — طرف نہ پکڑے تو تجھ کو ہیں بیشمار طرف
یہی وہ دل ہے، جو جھیلے ہے یہ ستم تیرے — مجال کیا، ہو ترے غم سے کوہسار طرف

نہ داغِ عشق سے قائمؔ ترے ہوں میں ہی خبر
یہ گل تو آپ کا پھولا ہے ہر چہار طرف

---

---

لہ م، قاصد، پتا ہے یار کے کوچے کا بوے خوں۔
ٰ ٢ م اور ل، دونوں میں "سرسری" ہے۔

پاسِ اخلاص سخت ہے تکلیف　　تاکجا خاطرِ وضیع و شریف
چشم و دل سے نہ تھی یہ چشم ہمیں　　کہ نہ گریے کے ہو سکیں گے حریف
صبح تک تھا وہیں یہ مخلص بھی　　آپ رکھتے تھے شب جہاں تشریف
مجھ سے تجھ بن کیا جو فصلِ ربیع　　کب یہ اشجار سے کرے ہے خریف
یوں کبھو تو نے مے نہ دی ساقی　　نا سے حلقوم کو سب سمجھتے قیف
اپنے تئیں آپ وہ نہیں پاتے　　فکر میں تجھ کمر کی ہیں جو ضعیف
کیوں نہ واہی ہو شعر قائمؔ کا
ہے دوانے کی آخرش تصنیف

---

# ق

اے محنت آزماے عاشق — جب خوش ہے کہ مرہی جائے عاشق
قاتل کی طرف سے ہو نہ دعویٰ — بس ہے یہی خوں بہاے عاشق
تلوار عبث تو کھینچتا ہے — کافی ہے نگہ براے عاشق
بوسے کے عوض جو ہو، تو ہے مفت — ملتی ہے کہاں دعاے عاشق
سو دیکھی جفا، پہ منہ نہ موڑا — رحمت ہے تجھے وفاے عاشق
شرمندہ نہ ہو، نکل جگر سے — اے نالۂ نارساے عاشق

ہجراں میں بھی مرگیا نہ قائمؔ
اس منہ سے تو اور کہائے عاشق

---

اب کے اگر بخیر ہے انجامِ اشتیاق — گنیے[1] گا سب مصائب و آلامِ اشتیاق
ہر صبح انتظار کا دیجے گا اس کو عرض — کیجے گا ذکر حالتِ ہر شامِ اشتیاق
کہیے گا یاد کر کے ہر اک دن کی سرگزشت — جن جن دکھوں سے کاٹے ہیں ایامِ اشتیاق
لکھ اشتیاق نامہ تو کاتب، پر اس طرح — ظاہر نہ حرفِ شوق ہو، نے نامِ اشتیاق
ایراد کر نہ پڑھ کے مرا خط، کہ یہ تمام — بے ربطیاں ہیں ثمرۂ ہنگامِ اشتیاق
ناصح، تو ضبطِ عشق سے کرتا ہے پختگی — لے جا ہے یاں تو اک ہوسِ خامِ اشتیاق

قائمؔ یہ سن کے میں تو تر آیا، کہ واے عقل
کس بات پر کیا ہے تو پیغامِ اشتیاق

---

[1] م، کہیے گا۔

# ک

اے راست وعدہ، شام سے تجھ بن سحر تلک — سو بار پھر گیا ہوں میں رات آکے در تلک
واقف میں پرفشانیِ صحنِ چمن سے کیا — پہنچا قفس میں کام مرا بال و پر تلک
کوچہ ترا نشے کی یہ شدت، جہاں سے لاگ — اللہ ہی نباہے میاں آج گھر تلک
اُس دشتِ پُرخطر میں ہمارا اُگا ہے نخل — پہنچا کوئی نہال نہ جس میں ثمر تلک
ہر چند جوشِ گریہ بہت کم ہوا ہے لیک — ڈوبے پڑے ہیں کوہ تو اب بھی کمر تلک
رونے کا اپنے ابر دکھائیں گے ہم مزا — پہنچا کوئی جو اشک کبھو چشمِ تر تلک

قائمؔ، میں اختیار کیا شاعری کا عیب
پہنچا نہ کوئی شخص جب اپنے ہنر تلک

---

ہر ذرۂ زمیں میں طوفاں ہے زیرِ خاک — کیا جانیے کہ کون یہ گریاں ہے زیرِ خاک
جنت نصیب عشق کی دولت ہوئے ہیں ہم — داغوں سے دل کے سیرِ گلستاں ہے زیرِ خاک
آلودگانِ گرد کو منعم، نہ پوچھ سہل — اکثر سنا ہے، گنجِ تہ پنہاں ہے زیرِ خاک
روئیدگی سے نرگسِ شہلا کی ہے عیاں — دیدار کا ترے کوئی حیراں ہے زیرِ خاک

قائمؔ، خیالِ زلف میں جو خاک ہو گئے
تا حشر اُن کی خاک پریشاں ہے زیرِ خاک

---

دل دیکھیے، دیا میں تجھ کو جاں تک — کوئی اور جگر کرے کہاں تک
آمادۂ سوختن ہوں یکبار — اے برق، مرے بھی آشیاں تک
صحبت کے مزے ہوں یوں بر آفتاد — اک بات ہو نا نہ پر نہ یاں تک

ہاں نالہ، کہ ہے یہ وقتِ امداد — پہنچی تو ہے آہ آسماں تک
آہستہ ہو اے نسیم، یک دم — ہمراہ ہیں ہم بھی گلستاں تک
قائمؔ جو ہے شمعِ بزمِ معنی — میں رات گیا تھا اس جواں تک
پایا، تو ہے ڈھیر آنسوؤں کا
دیکھا، تو گداز استخواں تک

---

مجھ بے گنہ کے قتل کا آہنگ کب تلک — آ، اب بنا ہے صلح، رکھیں جنگ کب تلک
پیارے نہیں یہ وقت ترا مقتضیِ ناز — بس درگزر اب اس سے، کر یہ ڈھنگ کب تلک
گزرا چمن سے عہدِ شگفتن تو جوں نسیم — دیکھیں، فلک رکھے ہے ہمیں تنگ کب تلک
انگشتری کی طرح ہوا قد تو یاں دوتا — باندھوں شکم پہ ضعف سے میں سنگ کب تلک
ساقی اگر یہی تو، یہی گل، یہی ہے فصل — سچ ہے کہ پاسِ نام و غمِ ننگ کب تلک
چہرے پہ اشکِ سرخ سے ہیں [1] سو طرازِ خوں — دیکھوں [2]، بہے ہے گریے کا یہ رنگ کب تلک
قائمؔ، خیالِ خطِ بتاں دل سے محو کر
ایسے اک آئینے پہ یہ سب زنگ کب تلک

---

۱؎ م، صد۔ ۲؎ م، دیکھو

# گ

ہیں جو کوئی کہ نالہ نیوشِ شکستِ رنگ
سنتے ہیں گوشِ جاں سے خروشِ شکستِ رنگ

اُمڈے پھریں ہیں ابرِ شفق گوں تو چار اور
کیا ہوگی اور شدّتِ جوشِ شکستِ رنگ

آگہ کیا ہے اِن نے مرے درد سے اُسے
کیونکر نہ ہوں میں حلقہ بگوشِ شکستِ رنگ

گر رحم اُس کے ضعف پہ، گر تجھ تک اے قبول
آجائے نالہ دست بدوشِ شکستِ رنگ

ظالم، کر اختلاط سے میرے حذر کہ میں
جوں برق، نت ہوں شعلہ فروشِ شکستِ رنگ

عالم کا عشق کے بھی دوانا ہوں میں کہ واں
نے علمِ بے خودی ہے، نہ ہوشِ شکستِ رنگ

قائمؔ تغیرِ حال کو پہنچے گا وہ ترے
سمجھے ہے جو زبانِ خموشِ شکستِ رنگ

# ل

بے دُرِ اشک مرے دیدۂ نم ناک کے مول
مفت میں ملتے ہیں تجھ کو یہ گہر خاک کے مول

زلفِ خوباں کی قلمرو میں بھی کتنا ہے اندھیر
لے ہیں شانے کے تئیں واں دلِ صد چاک کے مول

جن نے دیکھا ہے کہ کیا نشّے میں ہے عروج
لے نہ طارم کو فلک کے وہ کبھو تاک کے مول

جس چمن میں ہو ترے عارضِ گل رنگ کا ذکر
گل کو لیوے نہ کوئی واں خس و خاشاک کے مول

صید گہ میں تو کبھو عشق کی آیا نہ کہ خلق
دے کے جاں لیتی ترے حلقے کو فتراک کے مول

دانت تو نہیں مگر اُس منہ کی صفائی کے لیے
لیں ہیں ہر روز گلڈی شیخ جی مسواک کی مول

قائمؔ، افسوس کہ منصف ہیں وہ جوہر کے مرے
لیں ہیں کوڑی سے ہلاہل کو جو تریاک کے مول

---

دیکھ ٹک رنگ کو، بلبل تو نہ ڈھل بر سرِ گل
میں اسی کام میں کھائے ہیں یہ گل بر سرِ گل

ساقیا، عہدِ جوانی ہے نہ ہم سے ہو ملول
توڑیں مستی میں جو ہم ساغرِ مل بر سرِ گل

باغباں زمزمۂ مرغِ چمن سے غافل
جانتا نہیں کہ جبیں ہیں یہ دہل بر سرِ گل

دادِ عاشق کو کوئی پہنچے ہے معشوق کہیں
بلبل آنا تو عبث کرتی ہے غل بر سرِ گل

دیکھ گل گوشۂ دستار پہ اس کے قائمؔ
تو نے دیکھا جو نہ ہووے کہیں گل بر سرِ گل

---

گو اب مرے مزار پہ کوئی نہ لائے گل
ہیں داغ بے کسی کے جگر پر بجائے گل

آوارہ کر چمن میں مرے بال و پر نسیم
آئندہ تا نہ ہوئے کوئی مبتلائے گل

آئے اگر بہار تو کیا فائدہ کہ یاں
ناساز ہے مزاج سے اپنے ہوائے گل

نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی بہ تنگ　　کن نے مرے مزار پہ لا کر چڑھائے گل
ساقی، نہ کر درنگ کہ یاں ایک پل کے بیچ　　جاتا رہے ہے موسمِ نشو و نمائے گل
دیکھا ہو جن نے اس کے کفِ پا کو ایک بار　　جلوہ دے اس کی چشم میں کیونکر صفائے گل
قائمؔ، وطن کے بیچ تو آسودگی نہ ڈھونڈھ
پُر خار گلستاں میں ہمیشہ ہیں پائے گل

---

بے سبب آغوش کی صورت نہیں ہر چاکِ دل　　اس میں بھی اک رمز ہے، ہم جانتے ہیں یا کہ دل
مصلحت کوئی آن ٹل رہنا ہے اے ضبطِ نفس　　بے طرح بپھری ہے اب کی آہِ آتشناکِ دل
صحنِ صحرا موجِ سیلِ تند سے ہوتا ہے پاک　　کون بہرے غیرِ گریہ کے خس و خاشاکِ دل
گوہرِ شہوارِ اشک آتا ہے اُس طالب کے ہاتھ　　[ل]چشم کے پردوں میں چھانی جن نے برسوں خاکِ دل
ڈول ہی قائمؔ ترا تو دمبدم ہوتا ہے اور
آج کچھ کیا ہے پیارے یہ تجھے ناپاکِ دل (کذا)

---

بلبل میں بھی ہیں گرچہ خوش آوازیوں کے ڈول　　لیکن کہاں یہ زمزمہ پردازیوں کے ڈول
آ نکلے اے پتنگ کبھو یاں وہ شمع رو　　دکھلا دوں میں کہ ہوویں یہ جانبازیوں کے ڈول
دہ بازیِ فلک کی ہو کیا اُس نظر میں وقع　　دیکھے ترنج خانہ بر اندازیوں کے ڈول
کیا کیا ہیں لٹکے پھسلنے کے دل اس کی زلف میں　　دیکھ اے فسوں گر اُسکی فسوں سازیوں کے ڈول
قائمؔ ہے یہ فلک بھی عجب پیرِ طفل طبع
دیکھے جو اس کی غور سے تو بازیوں کے ڈول

---

[ل] م، چشم کے پردوں میں کی غربال جتنے خاک دل

کوتبِ عشق، کہ ہو چارۂ افسردنِ دل　　موت ہے شمع کی مانند مجھے مردنِ دل
موجِ خوں رات اُدھر عرش سے گزری تھی اگر　　گریہ یکدم بھی تو ہو مانعِ خوں خوردنِ دل
توڑنا دیر و حرم تک بھی نہ چنداں ہے گناہ　　اپنے مذہب میں ہے کچھ کفر تو آزردنِ دل
ہاں شبِ غم، نہ سحر ہو کہ مجھے گریے سے　　عوضِ اشک ہے اب وعدۂ آوردنِ دل
کیونکے دریا نہ بہیں خون کے آنکھوں سے مری　　پنجۂ موجِ نفس ہے پے افشردنِ دل
شب میں قائمؔ تجھے اُس بزم سے جاتے دیکھا
یوں بھی کہیں ہوئے ہے بیدرد بہ دروں بردنِ دل

---

پر ہے یہ مے سے رنگ کی اب کی ایاغِ گل　　جھمکے ہے مثلِ شعلہ ہر اک سو چراغِ گل
صرفے سے آہ و نالہ کر اے عندلیبِ زار　　ڈرتا ہوں میں کہ ہو نہ پریشاں دماغِ گل
دے کیوں نہ داغِ دل سے دمِ سرد اطلاع　　ملتا ہے نت نسیمِ سحر سے سراغِ گل
مت ڈھونڈھ ہم گرفتہ دلوں سے کشادِ طبع　　غنچے کو کیونکے ہوئے میسر فراغِ گل
قائمؔ، یہ کس کی بو کی ہے دریوزہ گر کہ صبح
ہر شاخِ گل رکھے ہے جو کف پر ایاغِ گل

---

ہے سبے اثر ایسی ہی جو اپنی کششِ دل
جی لے ہی کے چھوڑے گی یہ اک دن خلشِ دل
تھامو مجھے آمد میں کوئی اس کی کہ ناگاہ
لے جائے نہ گھر سے کہیں باہر طپشِ دل

---

[1] م، بہیں

زہراب و ہلاہل سے جو کچھ کام نہ نکلا
دے کر کے میں کی خونِ جگر پرورشِ دل

کس طرح کوئی گزرے تری رہ سے کہ پیارے
ہر گام پہ اُس کوچے میں ہے چپقلشِ دل

کیا نقش کہ خاطر سے ہوئے محو[1] مگر ایک
ہے نقش ترا آٹھ پہر منتقشِ دل

ہاتھوں سے دل و دیدہ کے آیا ہوں نپٹ تنگ
آنکھوں کو روؤں یا میں کروں سرزنشِ دل

دیکھو نہ اِسے اُس بتِ بیباک کو قائمؔ
زنہار کہ نازک ہے نہایت شیشۂ دل

---

لہ مخطوطے میں "مجکو" ہے۔ یہاں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔

# م

اب کی جو یہاں سے جائیں گے ہم — پھر تجھ کو نہ منہ دکھائیں گے ہم
مشکل ہے نہ آنا تجھ گلی میں — پتھر[1] یہ بھی سہی، نہ آئیں گے ہم
جو آگے کہا کیے ہیں تجھ سے — سو اب کی وہ کر دکھائیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا — ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم — جب گالیئں[2] نت کی کھائیں گے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یاں — اس عہدے سے کب بر آئیں گے ہم
جینے ہی سے ہاتھ اٹھائیں گے لیک — باتیں نہ تری اٹھائیں گے ہم
گر زیست ہے تجھ تلک تو پھر کیا — صدقے ترے، مر ہی جائیں گے ہم
اب کوچے میں تیرے ہی پیارے — کسی اور سے جی لگائیں گے ہم
جوں چاہیے چاہ کا سر رشتہ — جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

اس پر بھی اگر ملیں گے تو خیر
قائمؔ ہی نہ پھر کہائیں گے ہم

---

ہے زیر چرخ سزاوار حمد اس کا نام — رکھا ہے جن نے فلک کو بغیر تھونی تھام
وہ بت کہ شیخ جسے تو اللہ کہتا ہے — جو مغز بات کا سمجھے اسی کا ہے یہ نام
نہیں ہے قید کو انساں کی زر سوا کوئی جال — کہ ہر فلوس میں اس کے چھپے ہیں کتنے دام
ہو روم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چیں — یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سر شام

---

[1] م، یہ   [2] م، گالیاں

بطورِ ہزل ہے قائمؔ یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

---

ہیں مژگانِ دراز البتہ چشمِ یار کو لازم
درازی رات کی ہے مردمِ بیمار کو لازم
نہ خم ہو کیونکے زلف اس چہرۂ گلنار کے آگے
پرستش آگ کی ہے فرقۂ کفار کو لازم
شب اس سے لگ چلا تھا میں سو ہنس کر یہ لگا کہنے
کہ ہیں باتیں یہی اِس جبہ و دستار کو لازم
کروں کوتہ میں کس صورت سے قصہ زلف کا اُس کی
درازی بات کی ہے داستانِ یار کو لازم
نہ دے قائمؔ تو دل اُس لعلِ آتش رنگ کو ہرگز
کہ بچنا آگ کے شعلے سے ہے ہشیار کو لازم

---

جب موج پہ اپنی آگئیں چشم
دریا دریا بہا گئیں چشم
پنجے میں مژہ کے روتے روتے
اولے کی طرح بلا گئیں چشم
جوں اشک ہر اک کے آگے رو کر
نظروں سے مجھے گرا گئیں چشم
نرگس کو لگو نہ آگ یاں کی (کذا)
پھر مجھ کو وہ یاد آگئیں چشم
مانا رگِ گل سے ہیں یہ مژگاں
از بسکہ لہو سے چھا گئیں چشم
ٹالا تھا میں شب پہ گریۂ صبح
پر اُٹھتے ہی جان کھا گئیں چشم
بندہ ہوں میں اس ادا کا قائمؔ
دیکھا کہ وہیں سجا گئیں چشم

---

جوں نخلِ شمع، کب ہیں رہینِ بہار ہم — جز اشک و آہ رکھتے نہیں برگ و بار ہم
شیریں سا بھی اگر ہو کوئی قدرداں تو آج — ناخن سے چیر ڈالیں کئی کوہسار ہم
لے پہنچا تو صحنِ چمن تک ہمیں نسیم — آمادۂ سفر ہیں بہ رنگِ غبار ہم
شب سے ہمارے دن کو نہ کوئی کرے تمیز — واقع ہوئے ہیں بسکہ سیہ روزگار ہم
اے موج، ہم سے کر نہ خلش تو کہ جوں حباب — کوئی دم کریں ہیں اور نفس کی شمار ہم
قائم جگہ ہے رونے کی یہ حالتِ تباہ (ق) — اس صحنِ گلستاں کے ہیں وہ دل فگار ہم
کھٹکا صبا کے پانو کا سن کر بہ رنگِ بو — آغوشِ گل میں ہوتے تھے نت بیقرار ہم
کیا جانتے تھے ایک دن ایسی بہے گی باد — اس مرتبے کو ہوئیں گے بے اقتدار ہم

گل کا تو وصل دور ہے، پیدا نہ ہوئے گا
چاہیں گے گر خراش کو سینے کی خار ہم

---

کیا کیوں کرتا ہے کیا کیا وہ بتِ خود کام کام
لیک اس کو کون کہتا ہے مرا بدنام نام
کاسۂ مہ داغِ کلفت سے بھرا جن نے مدام
اس فلک سے چاہتا ہے بختِ بدانجام جام
مرغِ دل پر بستۂ الفت ہے، جاوے گا کہاں
زلف سے کھولے ہے کیوں اے سروِ گل اندام دام
آج[1] دو دو ہاتھ اس ابرو سے کیجے دو بدو
گو کرے دن کو مرے وہ تیغِ خوں آشام شام

---

[1] م، آج اس ابرو ہی سے کرنی ہے دو دو بات چیت

بخت کی اپنے خصوصیت ہے محرومی کے ساتھ
گو کہ اک عالم پہ ہو پیارے ترا انعام عام

اس بڑھاپے کی خدا ہی شرم رکھّے اے بتاں
عشق کے کوچے میں، میں مارا ہے بے ہنگام گام

دام زر کا مت بچھا قائمؔ کی وحشت کے لیے
اہلِ غیرت کو کرے ہے بیشتر اکرام رام

---

کب شمع گئی ہے سرستی یاں تک گزر کہ ہم
رکھتا ہے کب پتنگ یہ سوزِ جگر کہ ہم

اے ابر امتحاں ہے ہمارا ترا ابھی
دیکھیں تو یہ کہ روئے تو لختِ جگر کہ ہم

یہ بوالہوس ترے جو کہاتے ہیں اب غلام
خط آئے پر کوئی نہ رہے گا مگر کہ ہم

روکے ہے کون تیغ مری، عشق نے کہا
بولا اِدھر سے داغِ جگر، ہو سپر، کہ ہم

جھگڑے ہے اشکِ گرم مرا آہ سرد سے
دیکھیں تو پہلے پہنچے ہے تو عرش پر کہ ہم

جوں شمع جلتے مرتے ہی گزری تمام عمر
رکھتا ہے کوئی ایسی بھی شام و سحر کہ ہم

قائمؔ، نہ میں کہا تھا کہ مت پی شرابِ عشق
کھینچے ہے اب خمار سے تیں دردِ سر کہ ہم

---

## ن

میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغِ چمن میں
گل کتروں ہوں سو رنگ سے میں طرزِ سخن میں

کو شبنم الماس کہ تسکین دے جوں گل
باقی ہیں ابھی چاؤ جراحت کے بدن میں

بے چیز تو آشفتہ نہیں یہ، مگر اے شوخ
بستا ہے کوئی دل تری زلفوں کی شکن میں

لیتا ہو نہ خمیازہ تجھے دیکھ کے اک گل
غنچے کے بھی انداز ہے بوسے کا دہن میں

غربت میں مرا حال جو دیکھے ہے تو قاصد
زنہار نہ کہیو اسے یارانِ وطن میں

چوسے ہیں لبِ تیغ یہ کس کے کہ ہر اک دم
ایک کاوشِ نو ہے خلجان زخمِ کہن میں

اچھا[1] تو ہے قائمؔ کو دبا دیں جو اسی طرح
یہ آگ کا شعلہ، نہیں رکھنے کا کفن میں

---

ایک جا گہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا، صبح کہیں، شام کہیں

چشم نے جو مرے لختِ جگر کی کھو دی (کذا)
اُن نگیں کا تو نہیں سنتے ہم اب نام کہیں

اپنی قسمت میں ہے صاف تو ساقی معلوم
کاش پھینکے تو ادھر دُردِ تہِ جام کہیں

اے فلک، طرح سے مکڑی کے تو جالوں کو نہ پورے
وہ جو شہباز ہیں، آتے ہیں تہِ دام کہیں

اس کمر سے نگہِ شوق لپٹتی تو ہیں لیک
جی یہ دھڑکے ہے کہ آجائے نہ الزام کہیں

تم نے کی دل کی طلب، ہم[2] بھی کہا دیں گے، ولیک
یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں

پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اُٹھا
جن نے دیکھا تجھے یک بار سرِ بام کہیں

---

[1] م، اصلیہ ہے جو قائمؔ کو اسی طرح دبا دیں    یہ آگ کا شعلہ نہیں رکھنے کا کفن میں

[2] م، ہم نے کیا

عذرِ تقصیر بھی چاہوں گا میں اُس سے اے دل
ٹک تو خاموش ہو، دینے سے وہ دشنام کہیں

عزم کعبے کا تو قائمؔ تو کیا ہے لیکن
رہن مے کیجو نہ واں جامۂ احرام کہیں

---

جہاں کو وہ لبِ میگوں خراب رکھتے ہیں
خدا خیر، کہ یہ کیسی شراب رکھتے ہیں

اک آب تاب تو مہ و آفتاب رکھتے ہیں (کذا)
یہ روشنی کی تری کب وہ تاب رکھتے ہیں

نہ ہے خساستِ اہلِ جہاں کہ مثلِ گہر
گرہ میں باندھ کے دریا میں آب رکھتے ہیں

کس اعتبار پہ دیجے بتاں کو دل کہ بہ زور
جو کچھ کہ لے ہیں کسی سے یہ داب رکھتے ہیں

زبانِ عشق شکایت سے لال ہے ورنہ
ہم اک گلے کے ترے سو جواب رکھتے ہیں

نہ لٹ دھوئیں کی ہے ایسی، نہ زلف سنبل کی
جو بال سر کے ترے پیچ و تاب رکھتے ہیں

حبابِ بحر میں حاجب وجود ہی ہے، ہم آہ
ملیں کب اُس سے، یہ جب تک حجاب رکھتے ہیں

لیا ہی ہم نے بھی بوسہ، دیا ہی اس کو جو دل
یہ سچ ہے دوست دلوں میں حساب رکھتے ہیں

نہ کیوں انار کی بھری ہے شیخ جی سے لئیں (کذا)
سریں جو بہرِ وضو داب داب رکھتے ہیں

نہ جانے جاتے ہیں جوں شعلہ ہم کدھر قائمؔ
کہ ہر دم ایک نیا اضطراب رکھتے ہیں

---

جیتے جو تری چشم کے بیمار رہے ہیں
سو جی سے وہ مرنے کے طلبگار رہے ہیں

جوں صورتِ آئینہ، ترے محو، جو در سے
گزرے ہیں، تو پیارے پسِ دیوار رہے ہیں

نے جرم فلک کا ہی، نہ کچھ بخت کی تقصیر
خود رائی سے ہم اپنی سدا خوار رہے ہیں

اب تک بھی جنوں ہاتھ اُٹھاتا نہیں مجھ سے
ہر چند گریباں میں کئی تار رہے ہیں

بیداریِ شب شیخ ہمارے کی مسلّم
کیا جانے پہ کس کام میں بیدار رہے ہیں

---

ن م: پر جانیے کس کام میں بیدار رہے ہیں

کیوں تیغِ ستم میاں تو کرتا ہے کہ پیارے ‏ دو چار ابھی اور گنہ گار رہے ہیں
وہ خیرکشِ دانش ہوں کہ جبریل کو جس سے ‏ خدمت میں اک استاد کی تکرار رہے ہیں
دولت بھی عجب کی مے ہے، پہ انھیں کو ‏ جو مرد اسے پی کے خبردار رہے ہیں
پوچھ ہم سے تو احوالِ خرابات کہ قائمؔ
یک عمر ہم اس گھر میں بھی مختار رہے ہیں

---

ہزار مہر ہیں مخفی فلک کے کینے میں ‏ کرے ہے رخنہ عبث خضر کب سفینے میں
نہ کاد وکن سے ہو دل کی تو ایک دم غافل ‏ جو جانے یہ کہ دبا کیا ہے اِس دفینے میں
سمجھ کے شیشۂ دل کو پٹکیو اے بتِ مست ‏ بجائے بادہ، لہو ہے اِس آبگینے میں
گدا سرشت نہ قانع ہو شہر میں یک جا ‏ ہیں سیر ماہ کے سب برج ہر مہینے میں
میاں دکھا تو کہیں لے کے لختِ دل میرا ‏ یہ آب و رنگ ہے کس لعل کے نگینے میں
ہے یاد اُن لب و دنداں کی یاں بھی مایۂ عیش ‏ ہوں گو کہ لعل و گہر خلق کے خزینے میں
یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قائمؔ
پر اک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

---

گُل کا بھی تجھ سے کم تو میاں رنگ و بو نہیں ‏ پر گُل کو کیا میں آگ دوں لے کر جو تو نہیں
[1] اپنا قصورِ سعی ہے، ملتا جو وہ نہیں ‏ کیونکر ملے وہ، جس کی ہمیں جستجو نہیں
مرتا ہوں میں تمیز پہ ایام کی کہ یاں ‏ آگے خزف کے، دُر کی مرے آبرو نہیں
اے گریہ، کر نہ ہم سے طلب خونِ دل مدام ‏ یاں گھر فقیر کا ہے، کبھو ہے کبھو نہیں

---

[1] یہ شعر 'ل' میں نہیں ہے۔

ہے بوریے کے نقش سے عریاں تنی کی زیب — کیا لطف اُس لباس میں جس پر اتو نہیں
آخر نہ سی سکا نہ مرا زخمِ دل کوئی — سچ ہے کہ چاکِ شعلہ حریفِ رفو نہیں
کیا ہو کہ جس کو دیکھ کے خاطر سے ہو وہ محو — ہے گل میں آب و رنگ تو، اُس کی سی بو نہیں
قائمؔ، یہ سب جہاں ہے حقیقت میں عینِ حق
اصلِ حباب و موج بجز آبجو نہیں

---

اُس سے ہے ہستی تک اپنی، تفرقہ یک مو نہیں — نقطہ و خط دو ہیں جو الف میں، لیکن دو نہیں
حسنِ معنی چاہیے، تزئینِ ظاہر ہیچ ہے — کیا کرے اُس گل کو لے کوئی کہ جس میں بو نہیں
مدتوں اہلِ حرم پر حکمرانی کی ہے یاں — کیا ہوا اگر میکدے میں آج ہم کو رو نہیں
خوبرو دو دن کسی کے ساتھ کرلیں اختلاط — پر جو یہ چاہو کہ یہ ہوویں کسو کے سو نہیں
وضعِ دوراں گو خوشامد دوست ہی قائمؔ تو ہو
ہر کس و ناکس سے دب چلنا، یہ اپنی خو نہیں

---

کوئی مختار کہو یا کوئی مجبور ہمیں — ہم تو واقف ہیں کہ اصلا نہیں مقدور ہمیں
پانو یاں اپنے ٹھہرتے نہیں مانندِ سرشک — دیکھیں لیجائے کدھر یہ سرِ پرشور ہمیں
راستے سے کوئی ہم چوکیں ہیں مانندِ خدنگ — کان کے لگتے ہی گو پھینک دے تیں دور ہمیں
اپنی ہمت کو تو ہے لاکھ سلیماں سے بحث — گو فلک تو نے نہ دی قوتِ یک مور ہمیں
وہ بھی ہو آنکھ جو بہتی ہی رہے آٹھ پہر — کاش دیتے عوض اس چشم کے ناسور ہمیں
بختِ شہرت دیے بلبل کو فلک نے، ورنہ — خوب معلوم ہیں نالے کے قد و دستور ہمیں
تہ میں ہر اپنے ارادے[1] کے، دو عالم کے خلل — کاش یارب وہ نہ ہووے، ہائے[2] جو منظور ہمیں

---

[1] مخطوطے میں "آزادی"
[2] م، ہے جو منظور ہمیں

کس[1] طرح ہم سے مساعد ہو زمانہ، کہ بہ رغم — اس کے اوضاع کے، ہر بات ہی منظور ہمیں
مژدہ اے عشق کہ جہاں ہیں کوئی روز کے ہم — گر رکھے گا تو اسی طور سے رنجور ہمیں
داغِ[2] فرہاد تو اتنا نہیں قائم لیکن — غم نے مجنوں کے کیا مار کے بس چور ہمیں
دل[3] سے ہوتے ہیں کوئی مشفقِ اشفق قائم
کچھ عجب ڈول سے چاہے تھا وہ مغفور ہمیں

---

ربط کیا عشق سے تھا اس دلِ بیتاب کے تئیں
آگ میں جھونک دیا آپ میں سیماب کے تئیں
فکرِ تعمیر میں ہوں پھیرمیں گھر کی اے چرخ
اب تلک تو نے خبر دی نہیں سیلاب کے تئیں
آ پھنسا گردشِ دوراں میں جو کوئی، سو رہا
کیونکے ہو روے رہائی خسِ گرداب کے تئیں
تا مرے گریۂ مستانہ پہ کی اُن نے نگاہ
چشمِ گریاں ہیں ہر اک عضو سے دولاب کے تئیں
لالہ ساں ہجر نے اُس گل کے دکھائے ہیں یہ دن
ورنہ کیا کام تھا اِس چشم سے خوناب کے تئیں

---

[1] یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔
[2] م، داغِ فرہاد تو اتنا نہیں لیکن اے دل
[3] یہ مقطع ل، میں نہیں ہے۔

اے[1] لبِ ہرزہ سرا، تو بھی سمجھ قدرِ سکوت
سیپ کرتا ہے خموشی سے گہر آب کے تئیں

شمع[2] ساں رات میں جاگا تو، پہ بے دل کے حضور
ایسی بیداری پہ البتہ شرف خواب کے تئیں

آہ وہ یار کہاں ہیں جو ہمیشہ قائم
تازہ رکھتے تھے مرے عیش کے اسباب کے تئیں

گو مجھے اب بھی فلک دست دے دنیا پہ ولیک
جمع پھر کیجے کس طرح اُن احباب کے تئیں

---

قتل[3] کرتا ہے ہمیں وہ بتِ طنّاز کہاں — یاوری کرتے ہیں یہ طالعِ ناساز کہاں
غنچہ ساں گو کہ شگفتن ہو گرہ دل میں ولیک — اپنے طالع سے ہوائے فلکی ساز کہاں
ہم سری اُس قدِ رعنا سے ہو اے سروِ غلط — تو بھی ہر چند ہے موزوں، پہ یہ انداز کہاں
دل سے رخصت ہو بس اے خواہشِ گلگشت کہ اب — تابِ رفتار کدھر، طاقتِ پرواز کہاں
ہمتِ عشق نہ ہو حسنِ خط و خال میں بند — صید ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہاں
گو خموشی میں کیا پیشہ، پہ مجلس میں تری — بند رکھتے ہیں زباں اپنی در انداز کہاں

قائم اس باغ میں بلبل تو بہت ہیں لیکن
دل کھلے نالے سے جس کے وہ ہم آواز کہاں

---

شب کس سے ہم جدا رہے ہیں — تا صبح نبٹ خفا رہے ہیں

---

[1] [2] یہ شعر ل میں نہیں ہیں۔

[3] م، کشتہ کرتا ہے پسند ہم کو ترا ناز کہاں

آنا ہے تو آ، وگرنہ پیارے　　ہم آپ سے آج جا رہے ہیں
بیٹھیں پسِ کارِ خویش کیونکر　　جو ناز ترے اٹھا رہے ہیں
ویرانے سے میرے ڈر نہ اے چند　　اک وقت تو یاں ہما رہے ہیں
اے ہستی تو کھینچ نقشِ باطل　　ہم ہیں تو اِسے مٹا رہے ہیں
پھر عازمِ گریہ ہوں کہ طوفاں　　جوں ابر نظر میں چھا رہے ہیں
رونا ہے اگر یہی تو قائمؔ
اک خلق کو ہم ڈبا رہے ہیں

---

کون چاہے ہے بتاں تم سے مدارا کے تئیں　　پر تنک نرم کرو اس دلِ خارا کے تئیں
اس میں تیرے لبِ میگوں کی کہاں کیفیت　　ہم نے دیکھا ہے مئے لعل دوبارا کے تئیں
دیکھ بے وجہ نہ کھو دل کو ہمارے کہ ضرور　　آئینہ چاہیے خوبانِ خود آرا کے تئیں
دینداری کا ہوں میں شیخ کی بندہ جن نے　　دی جلا کفرِ یہودی و نصارا کے تئیں
بو سے اس زلف کی مانوس ہوا اپنا تو دماغ　　لے کے ہم آگ دیں کیا عنبرِ سارا کے تئیں
قائمؔ اس بزم تھا کون کہ جن نے نہ پیا　　شربتِ مرگ کے اس جام گوارا کے تئیں
پس بایں زیست جو کی روم کی تسخیر تو کیا　　ور لیا زور سے سو بلخ و بخارا کے تئیں
ہے جو کچھ ہوش، تو کر دیدۂ عبرت سے نگاہ
سُن کے تو قصۂ اسکندر و دارا کے تئیں

---

کل اے آشوبِ نالہ، آج نہیں　　آج ہنگامے پر مزاج نہیں
غیر اس کے کہ خوب روئیے، اور　　غمِ دل کا کوئی علاج نہیں
اب بھی قیمت ہے دل کی گوشۂ چشم　　اتنی یہ جنس بے رواج نہیں

شہ کو بھی چاہیے ہے گور و کفن　　کون ہے جس کو احتیاج نہیں
دل سے بس ہاتھ اٹھا تو اب اے عشق　　دہِ ویران پہ خراج نہیں
دو[1] جہاں بھی ملیں تو بس ہے ہمیں　　یاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں
کر نہ جرأت تو اے طبیب کہ یہ　　دل کا دھڑکا ہے، اختلاج نہیں
میں تو قائمؔ کہے تھا تجھ سے کہ آہ
دلِ نازک ہے یہ، زجاج نہیں

---

لے چکو دل جو نگہ کو تو یہ دشوار نہیں (کذا)　　لیک تم دیکھتے پھرتے ہو، خریدار نہیں
گو کہ مشرف بہ ہلاکت ہوں میں اس بار، پہ شوخ　　تو عیادت کو گر آوے تو کچھ آزار نہیں
تنگ تو ہم کو تو اے جیب کرے ہی لیکن　　اٹھ گیا ہاتھ گر اپنا تو پھر اک تار نہیں
گو سبک مجھ کو زمانے نے کیا ہے لیکن　　یہ بھی ہے شکر، کسی دل کا تو میں بار نہیں
مجلسِ مے سے مشابہ ہے خراباتِ جہاں　　جان کر یاں جو نہ ہو مست سو ہشیار نہیں
ہر بد و نیکِ جہاں اپنی جگہ ہے مطلوب　　کون سا عضو بدن میں ہے کہ درکار نہیں
مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائمؔ لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

---

شب ہو چکی تمام و سحر پھیر ڈھب نہیں　　تس پہ غضب تو یہ کہ، تو کہتا ہے اب نہیں
نسبت ہی شرط واسطے صحبت کے یاں کہ جنت　　حمّالۃ الحطب کا، بجز بو لہب نہیں
کہتا نہ تھا میں، دے نہ مجھے دردِ سر طبیب　　زائل ہو جو علاج سے، ایسی یہ تب نہیں

---

[1] م ۰ نعمت دو جہاں بھی بس ہے ہمیں

اس چشم دم بدم کو بھلا کیا کہے گی خلق　　　معشوق تو ہوا، تو میاں! کچھ غضب نہیں
دیکھا کسی سمے میں مگر آپ کو تو شوخ　　　یہ عشق آئینے سے ترا بے سبب نہیں
توڑیں[1] فلک کو بازوے ہمت تو عشق کے　　　فرہاد نے جو کوہ کو چیرا عجب نہیں
قائمؔ، خطا کی اُس سے جو تو لگ چلا کہ یار
مقبولِ جنابِ تاباں جز ادب نہیں

---

تا کجا مستی میں ناخوش دلِ احباب کریں
یک دو جام اور بھی ساقی کہ بس اب خواب کریں
ہر طرف ظرفِ وضو بھرتے ہیں زاہد، ہوئی صبح
ساقی اُٹھ، ہم بھی صراحی میں مےِ ناب کریں
ابرِ رحمت سے ہو تا مزرعِ امید دوچار
آ دل، اس کشت کو ہم اشک سے سیراب کریں
لے چکے دل تو بتاں، ان سے پرا تنا تو کہو
دل کے ہاتھوں میں نہ اِس جنس کو بے آب کریں
دل جو تجھ چاہِ ذقن میں ہے، نکلنا معلوم
تاکہ مژگاں سے تری چشم نہ قلّاب کریں
بلبلا لہروں میں پانی کی یہ کہتا ہے کہ یاں
سر وہی ہے کہ جسے عاشقِ محراب کریں
کارِ[2] دل ہاتھ سے ہے پارۂ خواہش کے تباہ
کیمیا ہوئے، جو ہم کشتہ یہ سیماب کریں

---

[1] مخطوطے میں "توڑے"
[2] یہ شعر "ل" میں نہیں ہے۔

کشتیِ ابرو کے اشارات سے واقف ہیں جو شخص
کیونکے ہو یہ کہ وہ سجدہ سوئے محراب کریں

جتنے اسباب تھے دنیا کے، سو دیکھے قائم
اب وہ اسباب ہو، ہم ترک یہ اسباب کریں

آہ یک دم بھی نہیں تاب ہے تجھے تو قائم
ہم ترا کیونکے علاجِ دلِ بیتاب کریں

---

وہ ہے کون دن کہ ترے لیے مجھے تجھ گلی میں گزر نہیں
ہے یہ کیا ستم کہ تجھے سجن مری اب تئیں بھی خبر نہیں

کرے کس طرح سے وہ سنگدل مرے حالِ خستہ پہ مرحمت
ہے مری طرف سے جو حرف زن، سو وہ آہ، جس میں اثر نہیں

---

جو خزائن ہیں چھپے آج مرے سینے میں
چشم بد دور، ہیں کس شاہ کے گنجینے میں

فارقِ نیک و بدِ دہر ہے تیرا پندار
ورنہ کچھ فرق نہیں شنبہ و آدینے میں

آخر اک روز تہِ خاک ہے منعم جاگہ
دب کے سولے کوئی دن اور بھی پشمینے میں

پھر استاد ہے اطفال کے حق میں سیلی
ورنہ کیا چرخ کو لینا ہے ترے کینے میں

اُس کفِ پائے نگاریں کے میں صدقے[۳] جس کی
لاتیں اب تک بھی سہلتی ہیں پڑی سینے میں

عشق کی بات نہ کہہ زاہدِ نافہم کے ساتھ
گاؤ کیا جانے کہ کیا لطف ہے لوزینے میں

صورتِ غیر کو قائم نہ جگہ دے دل میں
عکس جاتا ہی نہیں آکے اس آئینے میں

---

۱ ۲ یہ شعر ل میں نہیں ہیں۔ ۳ مخطوطے میں "شدرے"

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں — دونو عالم سے پھرے بیٹھے ہیں
جوں نمِ اشک تو کس سے ہے خفا — یاں کوئی پل میں گرے بیٹھے ہیں
دردِ دل کیونکے کہوں میں اُس سے — ہر طرف لوگ کھڑے بیٹھے ہیں
کوئی آیا ہی نہ بھولا، ہم تو — کب سے رستے کے سرے بیٹھے ہیں
گرم کر دے تو ٹک آغوش میں آ — مارے جاڑے کے ٹھرے بیٹھے ہیں
قلزمِ عشق کا اُلٹا ہے طریق — یاں جو ڈوبے سو ترے بیٹھے ہیں
کس کو دوں دوس تری مجلس میں — اپنے مشفق ہی ترے بیٹھے ہیں

ہم تو قائم نہ ٹھہرتے یک دم
لیک یاں دل کے گھرے بیٹھے ہیں

---

نہ بیمِ غم ہے، نے شادی کی ہم امید کرتے ہیں
قلندر ہیں، جو پیش آ جائے سب کچھ دید کرتے ہیں
کہاں کا غرّۂ شوال و کیا عشرہ ذی حجے کا
ہمیں ہاتھ آئے مے جس دن، اُسی دن عید کرتے ہیں
مزاجِ خس ہے اہلِ عشق کا، جلنے کے عالم میں
جلاتا ہے جو اُن کو، اُس کی یہ تائید کرتے ہیں
ارادہ تو نہ تھا اپنا بھی جانے کا ترے گھر سے
پہ کیا کیجے کہ بختِ واژگوں تاکید کرتے ہیں
یہ کاسہ سر تلے رکھّے، جو میخانوں میں سوتے ہیں
جسے چاہیں اسے اک جام میں جمشید کرتے ہیں

جنھیں کچھ سلسلے میں عشق کے تحقیق حاصل ہے
وہ کب مجنوں سے ہر گمراہ کی تقلید کرتے ہیں
نہ جانے کیسے کس قالب میں قائمؔ درد دل اُس سے
نہیں بنتی زباں سے، دل میں جو تمہید کرتے ہیں

---

یاں سے اٹھ، غیر کے گھر شب تو گیا، کہتے ہیں
بالے اے نیک مروت اسے کیا کہتے ہیں
دعویٰ مرگ سوا، سوچیے دل اور کچھ آج
یہ تو وہی بات ہے جو اُس سے سدا کہتے ہیں
کی نہ مجھ ناخنِ مژگاں نے گرہ اشک کی وا
ہٗ کو ہر چند کہ سب عقدہ کشا کہتے ہیں
جلوۂ آتش و خورشید نہیں بابِ سجود
اور ہی جھکے ہیں وہ جس کو خدا کہتے ہیں
بڑ نہ کہ بات کو تیں حضرت قائمؔ کی کہ وہ
مست اللہ ہیں کیا جانیے کیا کہتے ہیں

---

نہ دل بھرا ہے، نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھو جو روتے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں، پہ تیرے ہی دیکھنے کے لیے
حباب وار تنک دم رہا ہے آنکھوں میں
موافقت کی بہت شہریوں سے میں، لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثالِ حبابِ آئینہ
جگر سے اشک نکل، تھم رہا ہے آنکھوں میں
بسانِ اشک، تو قائمؔ ہے جب سے آوارہ
وقار تب سے ترا کم رہا ہے آنکھوں میں

---

کیا ہو گیا کہ نالہ اثر سے قریں نہیں
کیا آفت آئی آج کہ آہ آتشیں نہیں

---

لہ م، اسے ننگِ مروت

[1] جا نو تو مان جاؤ مری بات اب کہ آہ — ہاں ہاں[2] یہ کب تلک میں کروں، تم نہیں نہیں
کیوں ہم کو جرمِ نیم نگہ سے کرو ہو قتل — اک خلق دیکھتی ہے تمھیں، کچھ ہمیں نہیں
گر زیست اس طرح سے جہاں میں کہ بعدِ مرگ — نفریں کوئی کہے، نہ اگر آفریں نہیں
نرگس کی طرح ہجر میں اُس گُل کے کیا کہوں — چھٹتی کبھو ہے آنکھ سے یاں آستیں نہیں
کہتا ہے اس چمن میں لب جو پہ یوں حباب — کچھ یاں کی سیر اپنے تو خاطر نشیں نہیں
گر چاہیے ہزار، نہ واشد ہو دل کو یاں — اور ہوئے بھی تو غیرِ دمِ واپسیں نہیں

قائمؔ جو اعتبار سے رتبے کے دیکھیے
کم آسماں سے شعر کی تیرے زمیں نہیں

---

وائے اس دل پہ جو بے چین شب و روز نہیں
آہ اس سینے سے جس میں کہ ترا سوز نہیں

اے طرب پیشہ، تو کیا داب سے یاں کے ہے خبر
مجلس آرائیِ غم، صحبتِ نوروز نہیں

نالۂ دل نے کیا سینہ ہمارا غربال
کون کہتا ہے کہ یہ تیر جگر دوز نہیں

ہم فقیروں سے سدا خونِ دل اے عشق نہ چاہ
یاں جو یک روز میسر ہے تو یک روز نہیں

خدمتِ دیر و حرم کی میں جو یک عمر، تو کیا
در گہِ دل میں تو اب تک شرف اندوز نہیں

---

[1] م، مانو گے میری بات کو یا مانیں نہیں (کذا)   [2] ہاہا میں تا کجا کروں اور تم نہیں نہیں
[2] [illegible]

ہر در و بام سے پہنچوں ہوں میں مہتاب کی طرح
بزم میں اپنی وہ تا شمعِ شب افروز نہیں

اپنی وحشت سے تو یاں تنگ ہے اے دل ورنہ
خیمۂ چرخ کچھ اتنا تو زمیں دوز نہیں

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی، کیونکر کہیے
یوں وہ ناداں ہو، پر اتنا تو بد آموز نہیں

---

جوں شمع، دمِ صبح میں یاں سے سفری ہوں
ٹک منتظرِ جنبشِ بادِ سحری ہوں

نے گریۂ شب ہوں میں نہ آہِ سحری ہوں
جوں بانگِ جرس ہم نفسِ بے اثری ہوں

جاتا ہوں میں جیدھر کو، وہ منہ پھیرے ہے مجھ سے
گویا کہ میں گردِ قدمِ رہ گزری ہوں

دیکھا نہ میں جز سایۂ بازوے شکستہ
حرماں زدہ جوں حسرتِ بے بال و پری ہوں

میں پیرہن اپنے میں سماتا نہیں جوں گل
جس وقت سے آمادۂ جامہ دری ہوں

سو خضر سے کم جو صبا، وہاں جی سے گئے ہیں
جس وشتِ خطرناک کا میں رہ گزری ہوں

جوں سرو، رکھا رنگِ جفا سے مجھے آزاد
مرہون ترا جی سے میں اے بے ثمری ہوں

کیا کم ہوں سکندر سے، اگر دیکھیے مجھ کو
آئینہ صفت مالکِ خشکی و تری ہوں
کس بزم میں دیکھی ہے وہ جھلک کہ میں قائم
جوں شمع، سدا محوِ پریشاں نظری ہوں

---

کب اُن آنکھوں[1] کی ہم چشمی کریں تصویر کی آنکھیں
وہ مانی نے لکھیں اور حق نے یہ تحریر کی آنکھیں
رہی عاشق کی تیرے حسرتِ دیدار سمجھے گا
کھلی رہ گئی ہوں بعد از ذبح جس نخچیر کی آنکھیں
اگر عضوِ نزار اپنے نہ کرتے کام مژگاں کا
تو کتنی بدنما تھیں[2] حلقۂ زنجیر کی آنکھیں
تری آنکھوں کو کوئی نرگسِ خم گشتہ پہنچے ہے
ہوں خوبی میں برابر کب جوان و پیر کی آنکھیں
مری مژگاں جو تجھ بن اولتی کی طرح جاری ہیں
پڑی ٹپکے ہیں اس شدت سے کس دلگیر کی آنکھیں
بناتے زاہدِ خر کی شباہت، دستِ صانع نے
لیا منہ خرس سے اور وام کی خنزیر کی آنکھیں
ہے قائم رات دن اتنا جو تو مصروفِ مے نوشی
مگر دیکھی ہیں تیں اُس کافرِ بے پیر کی آنکھیں

---

۱؎ م، آنکھوں سے
۲؎ مخطوطے میں "تھی"

س اے طپیدنِ دل بس، کہ یاں تواں نہیں
جواب کی سانس لی تو نے کسو کی جان نہیں
جز اس دل کی نکالوں کہاں تجھے لے کر
جلے ہے گھر تو بہت سا، پہ وہ مکان نہیں (کذا)
جو چاہے روشنیِ دل، تو داغِ عشق اُٹھا
کہ گھر وہ تیرہ ہے جس میں کہ تابدان نہیں
یں ہیں اس سے کچھ آگے تھے آدمی موجود
اک اب بھی وقت کہ اُس نام کا نشان نہیں
ہزار بات بناتا ہے گھر میں یوں قائم
پہ جب ہو سامنے اس کے گویا زبان نہیں

---

ئیا یہ کام کب اس بختِ ارجمند سے میں — پھنسا قفس میں، جو چھوٹا چمن کی بند سے میں
ہے گو کہ جذب مرا تارِ عنکبوت سے سست — پہ شیر پھانسے ہیں اکثر اسی کمند سے میں
ہ تلخیاں کہ ذخیرہ میں کی ہیں غم میں ترے — نہ اُن سے ایک کو بدلوں ہزار قند سے میں
بعد سے بزم میں اپنی مجھے بھی رخصتِ سوز — گیا اخیر میں مری جان کیا سپند سے میں
تبانِ دہر سے قائم کیا میں کس کو پسند
ہوں اب ہمیشہ ندامت میں جس پسند سے میں

---

خوش رہ اے دل، اگر تو شاد نہیں — یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
اکھا امتحانِ صبر، کہ شوخ — آخرش دل ہے کچھ جماد نہیں
بس فتادوں کی یاوری میں عروج — خاک بن شانِ گرد باد نہیں

سچ ہیں سارے کمال حضرتِ شیخ ۔۔۔ لیک دل کو کچھ اعتقاد نہیں
میں کہا، عہد کیا کیا تھا رات؟ ۔۔۔ ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں
ایسے مصراعِ قد سے صد افسوس ۔۔۔ معنیِ مہر مستفاد نہیں
ہو جسے کس سے داد خواہِ بتاں ۔۔۔ اس ستم کی جہاں میں داد نہیں
یار اگر چاہتا ہے، دے قائمؔ
جان کچھ دل سے تو زیاد نہیں

---

جوں عبرتِ کور جلوہ گر ہوں ۔۔۔ البتہ کچھ ہوں میں پر کدھر ہوں
جوں شیشہ بھرا ہوں مے سے لیکن ۔۔۔ مستی سے میں اپنی بے خبر ہوں
جو کہیے سو یاں[1] سے ہے فرد تر ۔۔۔ کیا جانے میں کس مقام پر ہوں
اے صبر تنک تو رہ کہ تجھ سے ۔۔۔ دو چار قدم میں بیشتر ہوں
چل دامن و آستیں تجھے کیا ۔۔۔ لب خشک ہوں یا میں چشم تر ہوں
اے بخت سعید، تیری دولت ۔۔۔ اک یمن قدم سے ہوں جدھر ہوں
پروانے کی شب کی شام ہوں میں ۔۔۔ یا روز کی شمع کے سحر ہوں
جی مانگے ہے خوش دلی کو قائمؔ
تو بیٹھ کے رو، میں نوحہ گر ہوں

---

کون سا دن کہ مجھے اُس سے ملاقات نہیں ۔۔۔ لیک جی چاہے ہے جوں ملنے کو وہ بات نہیں
جس جھمکڑے سے کہ نت چشم مری ٹپکے ہے ۔۔۔ ایسی جھڑیوں سے تو برسی[2] کبھی برسات نہیں
رونقِ بادہ پرستی تھے ہمیں تک، جب سے ۔۔۔ ہم نے کی توبہ کہیں نام خرابات نہیں

---

(۱) م، واں
(۲) مخطوطے میں "برسا"

آنکھ لڑ جاوے، ہے پیدا اب بھی تو اُس کی محرم
لیک نظروں میں وہ آگے کی سی سمکھات نہیں

شیخ کی داڑھی کی جو کیسے بڑائی بیچ ہے
اِس سوا اور پہ اک پشم کرامات نہیں

آ جو ملتا ہے تو مل لے تو کہ فرصت ہے مفت
ایک چشمک میں مری جان یہ پھر رات نہیں

رکھ تو سرگوشی کے حیلے کو تو منہ پر قائم
بوسہ لینے کی اس انبوہ میں گو گھات نہیں

نہ کہہ کہ بے اثر انفاسِ سرد ہوتے ہیں
مجھی سے کیا کوئی سب اہلِ درد ہوتے ہیں

ہوس ہے عشق کی اہلِ ہوا کو، ہم تو میاں
سنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

متاعِ تجربۂ دنیا پہ کر نہ چشم سیاہ
کہ مالِ زن نہیں کھلتے، جو مرد ہوتے ہیں

یہ لت تجھی کو ہے پیارے، وگرنہ کیا کوئی
جو خوب رو ہیں وہ سب کوچہ گرد ہوتے ہیں

محیطِ وصل کو پہنچے ہیں وہ کوئی قائم
جو طرح سیل کے صحرا نورد ہوتے ہیں

عبث ہیں ناصحا ہم سے ز خود رفتوں کی تدبیریں
رکے ہے بحر کب، گو موج سے ہوں لاکھ زنجیریں

ہماری آہ سے آگے تو پتھر آب ہوتے تھے
یہ کیا جانے وہ اب کیدھر گئیں نالے کی تاثیریں

یہ اک صورت ہے گر کھینچے وہ میرے یار کا نقشہ
میں کب مانوں ہوں یوں مانی لکھے گو لاکھ تصویریں

لگائی آگ پانی میں یہ کس کے عکس نے پیارے
کہ ہم دیگر چلی ہیں موج سے دریا میں شمشیریں

سنا ہے تیں نہ گوشِ لطف سے احوال کو میرے
چھپی تھیں ورنہ خاموشی میں اپنی لاکھ تقریریں
رکھے ہے ہوش اگر تو، قصر کر طولِ عمارت کا
کہ اس بنیاد پر کب تک کرے گا تو یہ تعمیریں
گریباں کی تو قائم مدتوں دھجیں اڑائی ہیں
یہ خاطر جمع اس دن ہوئے جب سینے کو ہم چیریں

---

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں — کیجیے ہم اعتبار کرتے ہیں
یہ کہ یاں میں ہوں وائے ان کا حال — مجھ پہ جو افتخار کرتے ہیں
پرِ فرشتے کے اس جگہ جل جائیں — جس طرف ہم گزار کرتے ہیں
گو کہن دام ہیں ہم اے صیاد — لیک عنقا شکار کرتے ہیں
سی تو لینے دو جیب ناصح کو — اب کی ہم تار تار کرتے ہیں
دل کی دل جانے، ہم تو اپنا کام — اب کی کھیوے میں پار کرتے ہیں
گر رہا ہے رواق وہم غافل — فکرِ نقش و نگار کرتے ہیں
سر گیا نامہ بر کا واں اے وائے — یاں قدم ہم شمار کرتے ہیں
دل، تہی کیا کرے ہے تیں پہلو — ہم تو آپھی کنار کرتے ہیں

چلیے قائم کہ رفتگاں اپنا
دیر سے انتظار کرتے ہیں

---

آوے خزاں چمن کی طرف، گر میں رو کروں — غنچہ کرے گلوں کو صبا، گر میں بو کروں
آزردہ اس چمن میں ہوں مانندِ برگِ خشک — چھیڑے جو ٹک نسیم مجھے سو غلو کروں

آنکھوں سے جاے اشک گریں گل چمن چمن
منظورِ گریہ گر میں ترا رنگ و بو کروں

آیا ہوں پارہ دوزیِ دل سے نپٹ تبنگ
ایسے پھٹے ہوئے کو میں کب تک رفو کروں

کیا آرزو کہ خاک میں اپنی ملیں نہ یاں
کس رو سے اب فلک سے میں کچھ آرزو کروں

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور
باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں

سارے ہی اس چمن سے ہوا خواہ اُٹھ گئے
روؤں گلوں کو، یا میں غمِ رنگ و بو کروں

قائمؔ یہ جی میں ہے کہ تقیّد سے شیخ کے
اب کی جو میں نماز کروں، بے وضو کروں

---

لایق وفا کے خلق، سزاے جفا ہوں میں
جتنے ہیں یاں سو نیک ہیں، جو کچھ برا ہوں میں

جائے کہ ہوں یہ لوگ ترے پاس، اُس جگہ
کب قابلِ عنایت و مہر و وفا ہوں میں

مجھ کو بتاں کی دید سے مت منع کر کہ شیخ
کیا جانے اِس لباس میں کیا دیکھتا ہوں میں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی
سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

بیگانہ جن سے مل کے تو پیارے ہوا ہے یاں
اُن سب میں اک بڑا تو ترا آشنا ہوں میں

پوچھو ہو مجھ سے تم کہ پیے گا بھی تو شراب
ایسا کہاں کا شیخ ہوں یا پارسا ہوں میں

جورِ سپہر و دوریِ یاران و رشکِ غیر
جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں
آئینہ و غبار میں جوں یکدگر ہے ربط
جو پر کدر ہیں ان سے زیادہ صفا ہوں میں
قائمؔ، حیات و مرگِ بزو گاہ میں ہیں نفع
اس مردمی کے شور پہ کس کام کا ہوں میں

---

معلوم کچھ ہوا ہے نہ دل کا اثر کہیں
ایسا گیا کہ پھیر نہ پائی خبر کہیں
عالم میں ہیں اسیرِ محبت کے ہر کہیں
لیکن ستم کسو پہ نہیں اس قدر کہیں
کھولی تھی چشم دید کو تیری، پہ جوں حباب
اپنے تئیں میں آپ نہ آیا نظر کہیں
جوں غنچہ فکر جمع نہ کر ٹک تو گل کو دیکھ
قسمت کی کھو سکے ہے پریشانی زر کہیں
رہنے دو میری نعش کو ہو جائے تا غبار
لے جائے گی اڑا کے نسیمِ سحر کہیں
مصرف ہی ست بالشِ صیاد کا ترے
بسمل نہ بھر یو خون سے تو بال و پر کہیں
روتی ہے کیا گلوں کو تو شبنم! ادھر تو دیکھ
ٹکڑے ہے اس طرح سے کسی کا جگر کہیں
کرتا تھا کل گلی میں وہ اپنی خرامِ ناز
اس میں جو آ کے پڑتی ہے مجھ پر نظر کہیں
کہنے لگا یہ دیکھ کے احوال کو مرے
بدنام تو کسی کے تئیں یاں نہ کر کہیں
کیا ہتیا تجھے یہیں دینی ہے اے عزیز
اتنا بڑا ہے ملکِ خدا، جا کے مر کہیں
قائمؔ، یہ فیضِ صحبتِ سوداؔ ہے، ورنہ میں
طرحی غزل سے تیرؔ کی آتا تھا بر کہیں

---

تا چند تجھ پہ دور سے پیارے نظر کروں
دیکھوں ہیں تجھ کو مستِ مے اور درگزر کروں

---

؎ یہ غزل 'ل' میں نہیں ہے۔

نے سند ہے یاں، نہ زور، نہ طالع کی یاوری　　کیا جانے تجھ سے ملنے کا میں کیا ہنر کروں
ہم سے جلوں بلوں کا رلانا نہیں ہے خوب　　ایسا نہ کر کہ چشم کو اپنی میں تر کروں
یاں غیر محترم ہے، مری کیونکے بن سکے　　بہتر ہے اب جو گھر سے ترے میں سفر کروں

گزرے ہے پار جی سے قائمؔ نگاہِ ناز
کیونکر میں اس کے سامنے سینہ سپر کروں

---

کیدھر ابرو کی اس کے دھاک نہیں　　کون اس تیغ کا ہلاک نہیں
مثلِ آئینہ آبرو ہے، تو دیکھ　　ورنہ گھر میں تو اپنے خاک نہیں
دے ہے ہم چشمی اُس سے پھر خورشید　　کیا بلا اس کے منہ پہ ناک نہیں
چاہیں طوبا کی چھانو ہم زاہد　　کیا کہیں دار بستِ تاک نہیں
خبرِ غیب خطرۂ دل ہے　　ورنہ تا عرش اپنی ڈاک نہیں
یوں تو تائب ہیں مے سے ہم بھی پہ شیخ　　گر پلا دے کوئی تو باک نہیں
یاں وہ ملبوسِ خاص نہیں جوں گل　　جو قبا دس جگہ سے چاک نہیں
جس مصلّے پہ چھڑکیے نہ شراب　　اپنے آئین میں وہ پاک نہیں

قائمؔ اس کوچے میں پھرے ہے مگر
ابھی کچھ بات ٹھیک ٹھاک نہیں

---

صحرا پہ گر جنوں مجھے لاوے عتاب میں　　کھینچوں ہر ایک خار کو پائے حساب میں
اُس برق کی طرح سے کہ ہو وہ سحاب میں　　آتش دی بختِ بد نے مجھے عینِ آب میں
دیکھی تھی رات زلف کسی کی میں خواب میں　　اب تک ہے بال بال مرا پیچ و تاب میں
ٹک غور کر تو بوقلموں کا فلک کے ڈول　　اک رنگ ہی نیا ہے ہر ایک انقلاب میں

اُس شعلہ خو سے کسبِ حرارت کرے ہے داغ
ذرہ ہے جس کا سوزِ دلِ آفتاب میں

مے پی، جو چاہے آتشِ دوزخ سے تو نجات
جلتا نہیں وہ عضو[1] جو تر ہو شراب میں

جوں موج مجھ سے موجبِ بے طاقتی نہ پوچھ
اک عمر ہے کہ ہوں میں اسی اضطراب میں

قاضی خبر لے مے کو بھی لکھا ہے واں مباح
رشوت کا ہے جواز تری جس کتاب میں

روزِ شمار کو ہو مرے ساتھ باز پرس
میں کیا ہوں اور میرے گنہ کس حساب میں

یہ سرکشی ہے اتنی تنک مایگی پہ کیا
جھمکا[2] نہیں (ہے) بحر اگر اس سحاب میں

کیا کیجیے مُوئے چشم میاں تیری (ہی) جو کور
ظاہر ہے ورنہ حسن وہی ہر نقاب میں

ناصح نہ تازہ عشق کی میں وضع کی (ہے) راہ
ہر کچھ کرے ہے آدمی عہدِ شباب میں

قائم ہے یہ بھی طور کوئی زندگی کا یاں
گزری تمام عمر تری خورو (و) خواب میں

قائم ہو کس طرح سے بہم شکلِ اختلاط
وہ اُس غرورِ ناز میں ہم اس حجاب میں

---

کچھ قدر تیرے سامنے رکھتا ہوں میں نہیں
یا ہر کسی سے عشق جتاتا ہوں میں نہیں

اتنا تو ہوں ذلیل جو پوچھے ہے یہ کوئی
تو چاہتا ہے اُس کو تو کہتا ہوں میں نہیں

---

یوہیں رنجش ہو اور گلا بھی یوہیں
ہو جے ہر بات پر خفا بھی یوہیں

کچھ نہ ہم کو ہی بھا گیا ہے یہ طور
واقعی یہ کہ ہے مزا بھی یوہیں

صیدِ کنجشک سے نہ ہاتھ اُٹھا
آ کے پھنس جائے ہے ہما بھی یوہیں

جوں اجاڑا تو گھر مرا اے عشق
خانہ ویران ہو تیرا بھی یوہیں

کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل
کہ ہنسے تھا وہ بے وفا بھی یوہیں

---

[1] م ، رخت [2] ل : جھکا

اب تلک میری زیست نے کی وفا  بس میں دیکھی تری جفا بھی یوہیں
سب دل کو دیا کر اپنے گداز  ہاتھ چڑھ جا ہے کیمیا بھی یوہیں
یہ کہاں اور وہ گل کدھر قائمؔ
اک ہوا باندھے ہے صبا بھی یوہیں

---

مژگاں بھری ہیں آج جو ٹیڑھی نگہ نہیں  زلفوں میں پیچ و خم ہے جو بھوؤں میں گرہ نہیں
یاں تک تمنے میں شوق سے لبریز ہوں کہ شوخ  آوے جواب تو آپ تو تیری جگہ نہیں
آنسو مرے نہ خشک ہوں کیونکر ترے حضور  نورِ ستارہ پیشِ مہِ چاردہ نہیں
بیٹھے کسے کہے ہے کہ چل اٹھ کہیں کو جا  اس در سوا مجھے تو کہیں رو و رہ نہیں
یکدم ہوا جو عارض و خط سے ترے دوچار  پھر اس کو کچھ تمیزِ سفید و سیہ نہیں
کیوں گریہ، کیا وہ خونِ جگر ہو چکا تمام  کچھ آج اپنے اشک میں سرخی کی تہ نہیں
قائمؔ یہی فضا ہے گر اس دہر کی تو خیر
کھلنے کو[1] ایک دل کے بھی جس میں جگہ نہیں

---

نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں
یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی کلجھڑیاں
یہ اب کی شب برات اے یار تجھ بن ہم پہ یوں گزری
ہوائی تو ہماری آہ تھی اور اشک پھلجھڑیاں
ہماری آہ جیسے لخت دل سے گتھ کے نکلے ہے
کہیں دیکھی ہیں[2] تیں اس لطف سے پھولوں کی بھی چھڑیاں

---

[1] م: کو  [2] ل: ہے۔

موا مجنوں تو اک مدت ہوئی پر اب تک اُس غم میں
کریں ہیں نالہ ٹل[1] کر ہمد گر زنجیر کی کڑیاں
زمیں سے یہ لگو نہیں گل بھلا کس طرح نکلے ہیں (کذا)
جو لاکھوں صورتیں دلکش نہیں اس خاک میں گڑیاں
کبھو ٹوٹا نہ مژگاں سے مری آنسو کا زنجیرا
نہ جانے اشک کے قطرے تھے یا موتی کی یہ لڑیاں
بھری[2] آتی ہیں قائم پے بہ پے اس طرح آنسو سے
کہے تو چشم کو میری کہ ہیں یہ رہٹ کی گھڑیاں

---

پھوٹی[3] بھلی وہ چشم جو آنسو سے تر نہیں
کس کام ہے وہ سیپ کہ جس میں گہر نہیں

منعم ہے کیا کہ جس سے کوئی بہرہ ور نہیں
کس کام کا وہ نخل کہ جس میں ثمر نہیں

مجھ[4] سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

بندہ ہوں بے خودی کا میں اُس مست کی جسے
آشوبِ روزِ حشر سے اصلا خبر نہیں

یارب خلش سے آہ کی ہو جو نہ بہرہ مند
جس دل کا تکیہ گاہ سرِ نیشتر نہیں

اے[5] دل برنگِ غنچہ نہ مل گل کو خوں سے تو
اپنی گرہ میں ان کے کھلانے کو زر نہیں

ساقی[6] ہے شب کی دست درازی کا کیا گلہ
پیالے جو بے خودی میں ہوا معتبر نہیں

---

[1] م، تک کر [2] م میں یہ شعر بھی ہے ؎

سحر ہوتی ہی نہیں یہ شب کچھ آج کیا جانے
کہ لہرایے کہیں ..... گھڑیاں (کذا)

[3] م، کیا چشم ہے وہ چشم جو آنسو سے تر نہیں [4] یہ شعر ل میں نہیں ہے

[5] ل، اے گل

[6] م، ساقی تو شب کی دست درازی معاف کر ظالم قسم ہے مجھ سے مجھے کچھ خبر نہیں

نالاں نہ ہوں گلی میں تری میں تو کیا کروں — مرغِ چمن میں نالہ سوا کچھ ہنر نہیں
جوں اشک ایک لغزشِ پا میں گئے ہیں یاں — ہستی سے تا بہ نیستی چنداں سفر نہیں
قائمؔ تو اس طرح جو پھرے ہے خراب و خوار
اے خانماں خراب، مگر تیرے گھر نہیں

---

ترکِ وفا گرچہ صداقت نہیں — پر یہ ستم سہنے کی طاقت نہیں
ترک کر اپنا بھی کہ اس راہ میں — ہر کوئی شایانِ رفاقت نہیں
کوئی دوا مجھ سے کی کرتا ہے لیک — اب کے طبیبوں میں حذاقت نہیں
کسبِ ہنر کر نہ کہ اس وقت میں — اس سے بڑی اور حماقت نہیں
نام ہی قائمؔ کا گیا ہے نکل
ورنہ کچھ اتنی تو لیاقت نہیں

---

ہم تو دم بھی گر و نالۂ شبگیر کریں — پر کہیں ہو کہ ترے دل میں یہ تاثیر کریں
آہ اک جا سے بھی یہ جیب نہ ثابت نکلا — تا بخواہ مرے سینے کی تدبیر کریں
شارعِ سیلِ بلا ہم کو بتا دے اے چرخ[1] — جی میں ہے ہم بھی کوئی گھر کہیں تعمیر کریں
قید سے زیست کی مر کر بھی نہ چھوٹیں یارب — بے اجل مرنے میں ہم کچھ بھی جو تاخیر کریں
تا کجا کارِ جہاں دستِ فلک سے ہو تباہ — چاہیے اس کو اب اس کام سے تغیر کریں
حالِ دل یوں تو کسے کہنے کی جرأت اس سے — ہاں مگر یار کسی پردے میں تقریر کریں
وہ قوی رشتۂ الفت ہی ہے جس سے قائمؔ
بندھ کے چھوٹے نہ اگر شیر کو زنجیر کریں

---

[1] م، شارعِ سیل بلا جانے کیدھر ہے فلک

واشد کی دل کے اور کوئی راہ ہی نہیں　　　جز یہ کہ آہ کیجیے سو آہ ہی نہیں
تکلیفِ بزمِ اہلِ جہاں تا کجا کہ دل　　　مطلق میں واں کے رنگ سے آگاہ ہی نہیں
آ اے اثرؔ ملازمِ سرکارِ گریہ ہو　　　یاں جز گہر خزانے میں تنخواہ ہی نہیں
لازم تھے ہم بکارتِ دنیا کو اے فلک　　　تیں دی یہ دخت اُن کو جنھیں باہ ہی نہیں
قائمؔ متاعِ دل کو عبث کیوں کرے ہے خوار
اس جنس کی جہاں میں کہیں چاہ ہی نہیں

---

نے گریۂ شب ہوں میں نہ آہِ سحری ہوں　　　جوں بانگِ جرس ہم نفسِ بے اثری ہوں
جاتا ہوں میں جیدھر کو وہ منہ پھیرے ہی مجھ سے　　　گویا کہ میں گردِ قدمِ رہگزری ہوں

---

ٹکڑے کئی اک دل کے میں آنسو میں سیے ہیں　　　پھر صبح تلک رونے کے اسباب کیے ہیں
ساتھ رقیبوں کے ہے آشامیں کیں رات　　　یاں زہر کے سے گھونٹ اک عالم نے پیے ہیں
اے شمع اسی جلنے پہ اپنے ہے تو نازاں　　　دیکھ ہم کو کہ یاں داغ پہ ہم داغ لیے ہیں
عویِ فلک فہم کی قلت سے ہے ورنہ　　　سو بار ہم اس سفلے کو الزام دیے ہیں
قائمؔ نہ کسی کو ہو یہ کافر مرضِ عشق،
مرنے سے بتر ہو کے ہم اس دکھ میں جیے ہیں

---

ہم اسی طرح اگر خونِ جگر روتے ہیں[۲]　　　میرا کیا جائے گا اپنا ہی وہ گھر کھوتے ہیں
سرکیں ہے سبب خشمِ فراواں کا کہ ہوئے　　　نخل واں شعلہ جہاں تخمِ شرر بوتے ہیں

---

ل، کی

م: چشم یونہیں لعل سے گر لخت جگر روتے ہیں

شیخ جی کیونکے معاصی سے بچیں ہم کہ گناہ ارث ہے اپنی ہم آدم کے اگر پوتے ہیں
تاب کیا غیر کی اُس تیرِ نگہ کو جھیلے وہ ہمیں ہیں کہ جو یاں سینہ سپر ہوتے ہیں
کیوں لیے مرتے ہو بندے کو خدا سے تو ڈرو (کذا) میں ہوں کیدھر کو پڑا آپ کیدھر سوتے ہیں
چاہیے آدمی ہو بارِ تعلق سے بری کیوں کہ بیگانوں کے یاں بوجھ کو خر ڈھوتے ہیں
لوثِ عصیاں نہ گیا خرقے سے اپنے قائمؔ
گرچہ اک عمر ہوئی دیدۂ تر دھوتے ہیں

---

جس کو ہستی و عدم جانتے ہیں ہے وہ کچھ اور ہی ہم جانتے ہیں
کوچۂ حبیب سے ملحق ہے شیخ (کذا) ہم جسے راہ حرم جانتے ہیں
جزو کل ایک ہے جوں قطرہ و بحر بہت اس رمز کو کم جانتے ہیں
شاہدِ خوب و مکانِ دل چسپ ہم یہی حور و ارم جانتے ہیں
کہتے ہو آؤں گا میں اک دم میں ایسے ہم سیکڑوں دم جانتے ہیں
کہ نہ مرتے کھا مرے سر کی سوگند ہم تو اک یہ ہی قسم جانتے ہیں[1]
دل جو تابع نہ ہو اپنے قائمؔ
ہم اسے چھاتی پہ جم جانتے ہیں

---

غمزہ وہ بھی غرض اس دور میں ہم سے کم ہیں
ہاں مصیبت زدگاں کیوں نہ ہو آخر ہم ہیں
ضعف و بے طاقتی و خستگی سے شکوہ ہی کیا
عشق کہتے ہیں جسے اُس کے یہی عالم ہیں

---

[1] ل، ہم تو یہی اک قسم

ناصحا، تجھ سے کہوں درد کا دل کے کیا حال
جن پہ گزرے ہے وہ دکھ، اس سے وہی محرم ہیں
کیوں مرے مردنِ دشوار سے رکتا ہے تو
اب گزر جائیں یہ دو چار جو باقی دم ہیں
کل کے رونے میں تو قائمؔ وہ قیامت تھی پر آج
دیکھیں کیا ہووے، یہی گر مژۂ پُر نم ہیں

---

مجھے اس اپنی مصیبت سے ہو فراغ کہاں
کسی سے چاہوں کہ صحبت رکھوں دماغ کہاں

جو مجھ سے پوچھے ہو پوچھو حالِ خانۂ صیاد
میں کیا خبر ہوں کہ زیرِ فلک ہے باغ کہاں

قشونِ غمزہ ترا جس زمیں سے ہو نکلا
سوائے داغِ دل اس ملک میں چراغ کہاں

بنا ہوں آپ میں جوں تیوں کی رات تو ساقی (کذا)
نہ جانے شیشہ کہاں گر گیا ایاغ کہاں

کیا نہیں ہو جو قائمؔ کو قتل تیں تو میاں
لگے ہیں تیغ کو تیری لہو کے داغ کہاں

---

دور اس گل سے بس کہ داغ ہوں میں
رشکِ چندیں بہارِ باغ ہوں میں

ہو نہ مجھ سے جدا کہ جادہ صفت
منزلِ عشق کا سراغ ہوں میں

بوئے گل سالتی ہے دل میں مرے
آہ یہ کس سے بےدماغ ہوں میں

جس سے گردش میں ہیں خم افلاک
اُس مے تند کا ایاغ ہوں میں

کر بھروسا مرا نہ تو قائمؔ
صبح کے وقت کا چراغ ہوں میں

---

ہمارے درد دل کے تئیں یہ کب بے درد بوجھیں ہیں
ہم اپنے جی سے عاجز ہیں انھوں کو عیش سوجھے ہیں

---

ہر اک صورت میں تجھ کو جانتے ہیں
ہم اس بہروپ کو پہچانتے ہیں
ہے قادر تو خدا لیکن بتاں بھی
وہ کر چکتے ہیں جو کچھ ٹھانتے ہیں
تو ناصح مان یا مت مان لیکن
تری باتیں کوئی ہم مانتے ہیں
گئے گوہر کے تاجر جس طرف سے
ہم ان رستوں کی ماٹی چھانتے ہیں
نہ سنبھلا آسماں سے عشق کا بوجھ
ہمیں ہیں جو یہ مگدر بھانتے ہیں
مریدِ خاندانِ عشق جو ہے
ہم اپنا پیر اسے گردانتے ہیں
ٹکی ماریں ہیں دو رکعت پہ زاہد (؟)
نہ ڈنڈ پیلیں نہ مگدر بھانتے ہیں
بہت جاگے ہم اس محفل میں قائم
کوئی دم اب تو چادر تانتے ہیں

---

درد پی لیتے ہیں اور داغ بچا جاتے ہیں
یاں بلانوش ہیں جو آئے چڑھا جاتے ہیں
دیکھ کر تم کو کہیں دور گئے ہم لیکن
ٹک ٹھہر جاؤ تو پھر آپ میں آ جاتے ہیں
طرح سوزن کے جو ہیں رشتۂ الفت میں پھنسے
جس طرف سیر کریں رو بقفا جاتے ہیں
کون ہو غنچہ صفت اپنی صبا کا مرہون
جیسے تنگ آئے تھے ویسے ہی خفا جاتے ہیں
جب تلک پاؤں میں چلنے کی ہو طاقت باقی
حالِ دل آ کے کبھو تجھ کو دکھا جاتے ہیں
عشق کا کیونکے بتاں سے کرے اخفا کوئی
ڈھب سے نظروں میں یہ کافر وہیں پا جانے ہیں
رہیو ہوشیار تو اپ جیب سے بتاں کی قائم
بات کی بات میں واں دل کو اڑا جاتے ہیں

---

سیکڑوں ہیں آگہی غفلت کے بھی اسباب میں
دیکھتا ہے آدمی کیا کیا تماشے خواب میں

اے فلک کھوے گا کیا عقدے مری خاطر سے تو
سو گرہ ہیں مندمج اس قطرۂ سیماب میں

موج خیزِ دہر میں جرأت نہ کر غافل کہ یاں
گھاٹ سے ذرہ جو بہکا جا رہا گرداب میں

موت سے غافل نہ رہ پیری میں اے ناداں کہ صبح
یک بہ یک ہو جائے ہے ظاہر شبِ مہتاب میں

خون کی پیاسی رہے ویسی ہی ہے کر صبح و شام
کھائے غوطہ تیغ اگر تیری سراپا آب میں

جو خرابی کے مزوں سے یاں ہوئے ہیں آشنا
گھر نہیں کرتے بنا غیر از رہِ سیلاب میں

جاہِ[لہ] مقبل ناکسوں کو گر نہیں ناخوش تو سگ
بیشتر کرتا ہے کیوں غوغا شبِ مہتاب میں

منہ[علہ] چڑھا تھا سادہ لوحی سے جو وہ اک دن ترے
تر ہے تب سے آئینہ ویسا ہی اب تک آب میں

عشق چھٹ سر درد کے قائم ہزاروں ہیں علاج
اک نہیں لکھا کسی نے کچھ سو اس کے باب میں

---

روپے جو خرچ کے جامِ شراب لیتے ہیں — عوض میں نجم کے وہ آفتاب لیتے ہیں
معاملے میں : یہ چرچن سے ابر کے کم ہو (کذا) — کہ دُر وہ دیں ہیں جو دریا سے آب لیتے ہیں

---

لثلہ یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

محاسبے سے وہ صبحِ جزا کے امین ہیں — جو آپ روز و شب اپنا حساب لیتے ہیں
بسانِ شیشہ نکالوں میں کیونکے دل[1] کے بخار — کہ بولتے ہیں گلابیاں تو داب لیتے ہیں
دلِ خراب کو تو کیا کرے گا رے کے میاں — جنھیں نظر ہے وہ جنسِ خراب لیتے ہیں
وہ زر کو خرچ کے کرتے ہیں دردِ سر کی خرید — مباحثے کو جو ناداں کتاب لیتے ہیں

سوالِ[2] بوسہ جو قائم وہ مان جا ہے تو خیر
وگرنہ آج ہم اُس سے جواب لیتے ہیں

---

میں اس اخفا سے تیری یاد میں دل شاد کرتا ہوں
کہ خود واقف نہیں اب تک میں کس کی یاد کرتا ہوں
ہوا اک آبلہ تن مثلِ دف از بس ترے ہاتھوں
کوئی چھیڑے جو ٹک مجھ کو تو میں فریاد کرتا ہوں
تری مژگاں کے سودے میں کیا اک خلق نے جوہر
نہ میں ہی سینہ وقفِ خنجرِ فولاد کرتا ہوں
ٹک اے مرغِ چمن رکھ گوش تو ایدھر کو ہر ساعت
میں کیا کیا طرزِ نو اس کام میں ایجاد کرتا ہوں
قفس کا توڑنا نالے پہ میرے کام کتنا ہے
پہ میں پاسِ مزاجِ نازکِ صیاد کرتا ہوں
گلہ کرتا ہے کوئی تجھ سے کاہے کچھ اس میں حکمت ہو (کذا)
کہ میں ہر ایک سے تیرا شکوۂ بیداد کرتا ہوں

---

[1] م، دل کی بھڑاس — [2] م، وفائے وعدہ جو قائم کرے ہے وہ تو کرے

بغیر از قیس، قائمؔ، دشت اک مدت سے ویراں تھا
سو بارے اُس خرابے کو میں اب آباد کرتا ہوں

---

امتحاں کرنا جسے منظور ہو پیارے ہمیں
ہے یہ مردوں کا اکھاڑا، آکے للکارے ہمیں

ہوئیں صدقے آہ کس کس عضو کے تیرے ہم آپ
ہاں مگر سر پانو سے تجھ پر کوئی وارے ہمیں

جیتے جی تو ہم تباں سے ہاتھ اُٹھانے کے نہیں
گو خدا مرتے کسی احوال سے مارے ہمیں

اک نگہ کے جرم میں سو دیں دل چاہیے ہیں اب
عشق میں دینے پڑے کیا کیا گنہ گارے ہمیں

عشق نے فرہاد و مجنوں کو تو مارا اس طرح
دیکھیں اب پیش آئے کیا اس کام میں بارے ہمیں

وہ عرق آلود بال اک دن میں دیکھے تھے سو آہ
سیکڑوں راتیں کٹیں گنتے ہوئے تارے ہمیں

ایک قائمؔ عشق کی تدبیر میں عاجز ہیں ہم
ورنہ لاکھوں ہر مرض کے یاد ہیں چارے ہمیں

---

جینا ہے تلخ لذتِ مرگ آشنا کے تئیں
آتش دی کیا کسو کی وہ آبِ بقا کے تئیں (دکنا)

بیمار تیری چشم نے کی بسکہ ایک خلق
ملتا نہیں طبیب جو ڈھونڈھو دوا کے تئیں

نہیں صبر سی جہاں میں رسائن کوئی درست
حکمت سے راس لائے جو اس کیمیا کے تئیں

بک بک کے جوں جرس میں زباں آبلہ کی آہ
سمجھا یہ کوئی یاں نہ مرے مدعا کے تئیں

جانی ہے قدرِ صافیِ دل جن نے جوں گہر
رکھتا ہے باندھ کر وہ گرہ میں صفا کے تئیں

ہو داغِ دل سے کیوں نہ دمِ سرد متصل
گل سے ہمیشہ ربط ہے بادِ صبا کے تئیں

قائمؔ وہ باغِ دہر میں نخلِ عبث ہوں میں
اہلِ چمن پہ تنگ کیا جن نے جا کے تئیں

---

## و

جب وہ رخ روشن خطِ شبرنگ تلے ہو ۔۔۔ مانا ہے اس آئینے سے جو زنگ تلے ہو
سرِ شیخ کا جب[1] مدوں کی سرِ چنگ تلے ہو ۔۔۔ یہ ڈھنگ ہے کنکوں کی جوں بنگ تلے ہو
اُس ابرو کے آگے ہے یہ احوالِ دلِ زار ۔۔۔ جس طرح سے شمشیر کے جو رنگ تلے ہو
ہو صاحبِ جوہر کی سیہ روزی میں کیا قدر ۔۔۔ کم لیتے ہیں اُس تیغ کو جو زنگ تلے ہو
بس شمع یہ کیا شوخی ہے اُس مہر کے آگے ۔۔۔ لازم ہے ترا سر تو اے بے ننگ تلے ہو
جب راہِ حرم میں کوئی سج شیخ کی دیکھے ۔۔۔ یہ جانتے ہوں اور اُن کے خرِ لنگ تلے ہو
اُس لب سے ہوا پان کا رنگ ور سے کچھ اور ۔۔۔ جوں ڈانک کسی لعل کے خوش رنگ تلے ہو
ہوا بر سرِ باغ خجالت سے تمام آب ۔۔۔ ظاہر جو ترا رو خطِ شبرنگ تلے ہو

جو دست کہ یاں بندِ نگیں زیر ہے قائمؔ
اُس ہاتھ سے مانا ہے کہ جو سنگ تلے ہو

---

جب نہ تب مجھ سے جو تم دل کی طلب کرتے ہو ۔۔۔ دل یوہیں مفت دیا جاہے غضب کرتے ہو
موجبِ گریہ کہا میں نے تو کیا حاصل ہے ۔۔۔ یوں عبث کاہے کو تفتیشِ سبب کرتے ہو
شیشۂ دل ہے مرا کون سی گنتی میں بتاں ۔۔۔ تم تو ایک آن میں تاراج حلب کرتے ہو
جی سے کیوں جاتے میاں گر یہ کچھ آگے ہوتا ۔۔۔ جو تم اشفاق مرے حال پر اب کرتے ہو
جنبشِ لب کا تو مفہوم یہی ہے دشنام ۔۔۔ اور کیا مجھ کو دعا تم تہ لب کرتے ہو
ایک مدت سے میاں وہ تو موا پھرتا تھا ۔۔۔ آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو

قائمؔ اک بات میں جیتا ہے تمھاری لیکن
پرسشِ حال تم اس خستہ کی کب کرتے ہو

---

[1] ل ، رندوں کا۔

قبول عذر وہاں ہے جہاں ملال بھی ہو ۔۔۔ بہ جانِ پاک صفایاں جو کچھ خیال بھی ہو
وہ جا ہے صدر نشینی جو ہو ترا ہم چشم ۔۔۔ مجھے یہ کم ہے کہ جا گہ صفِ نعال بھی ہو
مثالِ آئنہ دل کو مرے صفا دے اگر ۔۔۔ غبار کا تری جانب سے احتمال بھی ہو
کمال جگ میں سزا وارِ ناز ہے یہ سچ ۔۔۔ پہ ناز کرنے کو انساں میں کچھ کمال بھی ہو
قصورِ خدمتِ احباب اس قدر قائمؔ
کچھ آدمی کو ہے لازم کہ انفعال بھی ہو

---

آگے کچھ اس کے ذکرِ دلِ زار مت کرو ۔۔۔ سب خیریت ہے اُس سے کچھ اظہار مت کرو
جانے دو جو نصیب میں ہونا تھا سو ہوا ۔۔۔ یارو، خدا کے واسطے تکرار مت کرو
آئینہ لے کے پہلے تنک سج تو دیکھ لو ۔۔۔ ملنے کا غیر کے ابھی انکار مت کرو
سر چڑھ رہا ہے کال یونہیں عاشقوں کے پاں ۔۔۔ پھیٹے سے تم یہ بال نمودار مت کرو
اے آہ و نالہ جیب کے میں آیا ہوں اس جگہ ۔۔۔ عالم کو شور کر کے خبردار مت کرو
اپنی بساط میں تو یہی جنسِ دل ہے یاں ۔۔۔ گو اب پسند اس کو خریدار مت کرو
پیارے کمر کہاں ہے تمھارے، یونہیں بظن ۔۔۔ سن کر کسی سے جھوٹھ پہ اصرار مت کرو
قائمؔ وہ بت کہے تھا شب احوال خلق دیکھ
مجھ سا تو حق کسی کو طرحدار مت کرو

---

میں ہوں کہ میرے دکھ پہ کوئی چشم تر نہ ہو ۔۔۔ مر بھی اگر رہوں تو کسی کو خبر نہ ہو
اے وہ کہ خس سے شعلے کو کرتا ہے تو بلند ۔۔۔ انصاف ہے کہ آہ میں میری اثر نہ ہو
آوارہ دل کے جانے سے آخر ہوئے یہ اشک ۔۔۔ طفلی میں یا الٰہی کوئی بے پدر نہ ہو
پیتا ہے دل اگر تو مےِ عشق نوش جاں ۔۔۔ لیکن ٹک احتیاط کہ یاں شور و شر نہ ہو

دیتے تو دل کے نفع میں تجھ کو لیا تھا میں پر اب یہ سوچ ہے کہیں جی کا ضرر نہ ہو
سیکھا ہم سے دابِ گریہ کہ اے مدعی اگر سو خوں روئیں تو ایک مژہ اپنی تر نہ ہو
پیارے نہ بے نقاب گزر کر ہر ایک سو دھڑکے ہی جی مرا کہ کسو کی نظر نہ ہو
ہر جامہ زیب دل کو رکھے کس طرح سے گھیر پیارے جو اس لباس میں تو جلوہ گر نہ ہو

قائمؔ اسی قدر جو ضروری ہے عرضِ شوق
کر تو ہی قصد، گو نہ ہوا نامہ بر نہ ہو

---

رہنے دے شب اپنے پاس مجھ کو اوروں سا نہ کر قیاس مجھ کو
رہ جا کہ کہوں گا حال دل کا آجائیں تنک حواس مجھ کو
دل نازک و کارِ عشق درپیش اپنا ہے نپٹ ہراس مجھ کو
یارب گیا کون یاں سے جہاں لگتا ہے یہ گھر اداس مجھ کو
محرم سے تو سنیو حال میرا نہیں طاقتِ التماس مجھ کو
حیرت نے کیا ہے یک جہاں کا جوں آئینہ روشناس مجھ کو

کو جامۂ خاک و خوں کہ قائمؔ
سمجھا تھا وہی لباس مجھ کو

---

ہم موئے پھرتے ہیں اور خواہشِ جاں ہے اس کو
اب تلک بھی وہی جینے کا گماں ہے اس کو
اے دل افسردگی داغ سے کیوں ہے تو ملول
جو[۱] گل اس باغ میں آیا ہے، خزاں ہے اس کو

---

۱ ل، جوں

قصۂ برہنہ پائی کو مرے اے مجنوں
خار سے پوچھ کہ سب نوکِ زباں ہے اس کو

آگے اس گل کے نہ مارا کبھو غنچے نے تو دم
چاہے بلبل سو کہے تابِ بیاں ہے اس کو

اے فلک! بوجھ دو عالم کا تو قائمؔ پہ نہ ڈال
اپنی ہستی بھی یہ کچھ ان روزوں گراں ہے اس کو

---

کرکے ہے ہے، اے نمِ اشک تو رووے مجھ کو — آج اگر سیل میں خوں کے نہ ڈبووے مجھ کو

خاک جوں آینہ ملنا مجھے رکھتا ہے شگون — تیرہ تر ہوں میں جو پانی سے تو دھووے مجھ کو

فائدہ گل کا نہ مجھ سے ہے نہ سایے کی امید — کہہ دو دہقاں سے کہ بیہودہ نہ بووے مجھ کو

گرمیِ نالہ سے میں آج جلا جاتا ہوں — کو دمِ سرد کہ آ کر وہ سمووے مجھ کو

[1]ساتھ ہے سنگ و شرر کا، یہ کہو اس بت سے — کیا ہو تا آغوش میں گر لے کے وہ سووے مجھ کو

نہ ملاقات، نہ اشفاق، نہ وعدہ، نہ پیام — کیونکے تسکین ترے ہجر میں ہووے مجھ کو

خاتمِ دستِ سلیماں سے ہوں قائمؔ میں عزیز
سخت بیجا ہے وہ جو ہاتھ سے کھووے مجھ کو

---

ضائع نہ کر تو دام میں صیاد دانے کو — دیکھا ہے لاکھ رنگ سے میں نے زمانے کو

بدنامیِ گریہ پہ مرے ناحق ہے ہم نشیں — ڈھونڈھے تھا دیر سے وہ ستمگر بہانے کو

گریاں یہ سرد مہریِ گل ہے اسی روش — دیں گے ہم آگ خار و خسِ آشیانے کو

---

[1] م: سنگ میں کہتے ہیں جا گہ ہے شرر کی پیارے — ہے بجا، اے جو تو آغوش میں سووے مجھ کو

آئی تھی تجھ پہ اے دلِ صد چاک کیا بلا — دی تو نے راہ زلف میں اس کی جو شانے کو
ہر سمت پھینکے چاہیے یوہیں خدنگِ سعی — شاید کبھو تو مار رہیں گے نشانے کو
ہاتھوں سے نیشِ غم کے گریزاں ہو اب شکر — اُس طفل ساں کہ چھیڑے وہ زنبور خانے کو
قائم سوا اور بھی شاعر ہیں یاں بہت
لیکن یہ حرفِ درد و گپ عاشقانے کو

---

شکوہ نہ بخت سے ہے، نے آسماں سے مجھ کو — پہنچی جو کچھ اذیت، اپنے گماں سے مجھ کو
قاصد، کہے تو ہے تو، پوچھے تھا حال میرا — تصدیق اس کی لیکن ہووے کہاں سے مجھ کو
عاشق نہ تھا میں بلبل کچھ گل کے رنگ و بو کا — ایک اُنس ہو گیا تھا اس گلستاں سے مجھ کو
جاتا ہوں جس جگہ اب واں خانماں ہے میرا — کھویا ہے اے فلک تیں گو خانماں سے مجھ کو
با وصفِ بے کمالی عزت طلب ہوں قائم
درخورہ ہو سو کیونکر اہلِ جہاں سے مجھ کو

---

ناصحا، کر نہ اسے سی کے پشیماں مجھ کو — کتنے ہی چاک ابھی کرنے ہیں گریباں مجھ کو
وحشتِ دل کوئی شہروں میں سما سکتی ہے — کاش لے جائے جنوں سوئے بیاباں مجھ کو
اہلِ مسجد نے جو کافر مجھے سمجھا تو کیا — ساکنِ دیر تو جانے ہیں مسلماں مجھ کو
میں سرِ مو نہیں جوں زلف کسی سے شاکی — با دوستی نے کیا میری پریشاں مجھ کو
سچ کہو کس سے ہے یہ نین کھلانے کا شوق — بھیجتے ہو جو پئے سرمہ صفاہاں مجھ کو
یہاں تلک خوش ہوں امارد سے کہ اے ربِ کریم — کاش دے حور کے بدلے بھی تو غلماں مجھ کو
مفت تک تو کوئی قائم نہیں لینے کا یہ جنس
کہ فلک سے، کرے کچھ اور بھی ارزاں مجھ کو

---

کبھو دکھا کے کمر اور کبھو دہاں مجھ کو
بہت بہ تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

وہ دن گئے کہ اُٹھاتے تھے نازِ نکہتِ گل
ہے بید ماغیِ دل ان دنوں گراں مجھ کو

میں رہگذر میں پڑا ہوں برنگِ نقشِ قدم
تیں چھوڑا کس کے بھروسے پہ کارواں مجھ کو

میں ہوں تو مرغِ چمن پر غلط بگا ہی سے
ہیں کتنے روز کہ بھولا ہے آشیاں مجھ کو

تو اتنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر
بہت ہے سایۂ دیوارِ گلستاں مجھ کو

روا رکھوں نہ کہ ہووے ملک بھی پاس ترے
کیا ہے بس کہ محبت نے بدگماں مجھ کو

مری نظر میں ہے قائمؔ یہ کائنات تمام
نظر میں گو کوئی لاتا نہیں ہے یاں مجھ کو

---

ٹک تو خاموش رکھو منہ میں زباں سنتے ہو
اپنی ہی کہتے ہو، میری بھی میاں سنتے ہو

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

خشک و تر پھونکتی پھرتی ہے سدا آتشِ عشق
بچیو اس آنچ سے اے پیر و جواں سنتے ہو

دم قدم تک بھی ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو

میں کہا، خلق تمہاری جو کمر کہتی ہے
تم بھی اس کا کہیں کچھ ذکر و بیاں سنتے ہو

ہنس کے یوں کہنے لگا، خیر اگر ہے یہ بات
ہووے گی ویسی ہی جیسے کہ دہاں سنتے ہو

حضرتِ دردؔ کی خدمت میں جب آ قائمؔ نے
عرض کی یہ کہ اے استادِ زماں سنتے ہو

امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو

راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کبھو کج طینت
تیر بنتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو

---

آتنی اے دیدہ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو
دیکھیں کیا ہوئے، خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

شکر گندن سے اس عارض کا یہی ہے پیارے
کہ کوئی بوسہ فقیروں کو بھی امداد کرو

کندنِ کوہ جگر کام ہے کتنا مشکل
اے دل و دیدہ جو تم ہمتِ فرہاد کرو

ہر طرح شاد یہ ناشاد ہے تم شاد رہو
خواہ ناشاد رکھو خواہ مجھے شاد کرو

کیونکے یاد میں کروں صبر اس آفت میں بھلا
جو مناسب ہو مرے حق میں تم ارشاد کرو

زور سے دل کو مرے لے کے یہ کہتا ہے وہ شوخ
جی جہاں چاہے تمھارا مری فریاد کرو

حال قائمؔ کا میاں آج نہایت ہے تباہ
جانو تو بند تم اس خستہ کی آزاد کرو

---

کب دل نے مضطرب نہ کیا اضطراب کو
کس دن نہ پیچ و تاب دیا پیچ و تاب کو

کب تک علاج دل کی طپش کا کیا کروں
تا چند روؤں دیدۂ خانہ خراب کو

دل تو کہے سنے سے سمجھتا بھی ہے کبھو
جو جو کچھ ہو سو دیدۂ خانہ خراب کو

تشبیہ آئنے کو ترے منہ سے کیونکے دوں
گو اس میں اک صفا ہو پہ یہ آب و تاب کو

جب دیکھتا ہوں در پئے تزئیں کسی کو یاں
روتا ہوں یاد کرکے میں اپنے شباب کو

یک دم میں ہم وجود سے یوں پہنچے تا عدم
لیجاتا ہے جیسے باد کا جھوکا حباب کو

کیونکر نہ ہو دماغ مہ و مہر چرخ پر
دیکھا نہیں انھوں نے مرے آفتاب کو

قائمؔ خدا کے واسطے بدمستیاں یہ چھوڑ
بدنام اس سے زیادہ نہ کر تو شراب کو

---

راہ پنیڈے اسے رکھتا ہوں اگر گھیر کبھو
ہنس کے کہتا ہے مجھے کام ہے اب پھیر کبھو

بھیجیو ہم کو بھی پہنچا تو وہیں اے قاصد
واں سے یک دم بھی جو پھرنے میں تو کی دیر کبھو

آج کچھ خیر نہیں دل کہ وہ قاتل ہر دم
کارد کھینچے ہے کبھو دیکھے ہے شمشیر کبھو

جب سے جوں آئینہ اس منہ پہ کھلی آنکھ مری
ہائے رے شوق کہ دیکھا ہی نہ میں سیر کبھو

تو وہ گوہر کا ابھی یک دو فلک ہو قائمؔ
انجمِ اشک کو اپنے میں کروں ڈھیر کبھو

گردش شبانہ روز نہیں یہ سپہر کو　　صدقے کرے ہے کہ یہ ترے ماہ و مہر کو
کعبے کا عزم ہم تو مسلماں میں اب نہیں (کذا)　　دیکھا ہے جب سے اس صنمِ خوب چہر کو
قائمؔ میں اس سے چشمِ محبت رکھوں ہوں یاں
کرتا نہیں تمیز جو کینے سے مہر کو

---

نے ہجر چاہتا ہوں نہ وصلِ حبیب کو　　یارب کہیں ہو صبر دلِ ناشکیب کو
وے بھی تو آدمی ہیں کہ جن سے تمھیں ہے ربط　　کیا شکوہ تم سے، روییے اپنے نصیب کو
اپنے[۱] لیے کہے ہے تمھیں کون کچھ کرو　　لیکن بہت بُرا ہے ستانا غریب کو
اصلاح کا جنوں کی مرے نت اسے ہی فکر　　یہ کیا[۲] دوا نہیں ہے الٰہی طبیب کو
بلبل نہ کر دراز زباں تو کہ گل کی یاں　　خاموشی پہ قفا سے نکالے ہیں جیب کو
آدابِ ناز جن نے سکھائے تمھیں ہیں شوخ　　مقدور ہو تو دیجے ادب اُس ادیب کو
قائمؔ[۳] سخن سرا ہے وہ اس ڈھنگ سے بھلا
تیں بولتے سنا ہے بہت عندلیب کو

---

یارو کیوں بکتے ہو بیفائدہ. مجھ سے جاؤ　　اتنی کہتے ہو مجھے، اتنی اسے سمجھاؤ
وہ نہیں تو کہ تجھے غم ہو کسی عاشق کا　　جیو کوئی اپنے نصیبوں سے کوئی مرجاؤ
کہیو یارو مری تنہائی کا اس سے احوال　　گر کسی وقت کہیں اُس کو اکیلا پاؤ

---

۱؎ م، کہتا ہے کون اپنے لیے چاہو سو کرو

۲؎ م، کچھ اندنوں میں خبط ہوا ہے طبیب کو

۳؎ م، قائمؔ سخن سرا ہے جس انداز سے تو یاں　　یہ زمزمے ہیں یاد کہاں عندلیب کو

یاں اُلجھنے کا نہیں قصد کسی سے پیارے | گو تری زلف ہمیں دیکھ پڑی بل کھاؤ
کب ہوا یہ کہ میں ہاتھوں سے انھوں کے نہ جلا
قائمؔ اس دل کو لگو آگ، یہ جی جل جاؤ

---

شمع ساں جلنے کو صانع نے بنایا مجھ کو | جس کے میں ہاتھ پڑا اُن نے جلایا مجھ کو
تھا بدو نیکِ جہاں سے میں عدم میں آزاد | آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھ کو
دوست ڈالا تھا یہ کس دشمنِ جانی نے کہ رات | پائی شمشیر اگر تیں، تو نہ پایا مجھ کو
تھا شبِ ہجر سے کیا سابقہ دل کو میرے | تم نے یہ روزِ بد اے چشم دکھایا مجھ کو
بھول کر بھی نہ گیا یاد سے اپنی تو وہ شوخ | جان کر یاد سے جن نے کہ بھلایا مجھ کو
سو بسے کچھ تو خلل تھا کہ شب اُن نے محرم (کذا) | غیر کے آتے ہی مجلس سے اٹھایا مجھ کو
میں تو اس بات پہ مرتا ہوں کہ اُن نے قائمؔ
کس طرح پردے سے کل بول سنایا مجھ کو

---

ہوئی جلا داغ سے چھینٹوں کے ترے سینے کو | آبرو بخشی ہے جوہر نے اس آئینے کو
صافیِ دل نے تو یاں تلخ کیا جینے کو | کاش کہ تیرہ کرے زنگ اس آئینے کو
یہ جو نفرت سی ہے اسے مجھ سے، نہ جانے ہمدم | دل میں دی کیونکے جگہ ان نے مرے کینے کو
دوش کیا دیدۂ و دل کا ہے کہ یاں تو پیارے | جو کوئی ہے سو وہ اپنے ہی لہو پینے کو
بوق[1] اس بادہ پرستی پہ جو ہو کر بدمست | در پہ مسجد کے گرے آ کے نہ آدینے کو
دیدہ و دل ہی کو کیا روئیے یاں تو پیارے | مستعد سب ہیں مرے خونِ جگر پینے کو
ساقِ سیمیں کا تری کیوں نہ بسے دل میں خیال | آرے ویرانہ سزاوار ہے گنجینے کو
اون[2] کی کملی سے خوگر ہیں جو منعم اپنی | پشم جانے ہیں وہ ہر جنس کے پشمینے کو

---

۱ ل: یوف۔ ۲ یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

درد و غم چھوٹ ہے کچھ اس دل میں بھلا اور بھی جنس
چیر کر دیکھ تو قائمؔ تو مرے سینے کو

---

اگر عرصے میں تو محشر کے با ایں قد و قامت ہو
ہیں جو اہلِ قیامت، اور ان پر اک قیامت ہو
خفا رہتا ہے تو اس بندگی پر مجھ سے کیا معنی
کریں ہیں پاس اُس کا جس سے ٹک صاحب سلامت ہو
بہت چاہا میں، دل دیجے نہ اُس کی زلف کو ہرگز
پہ ٹالے سے وہ کب ٹلتی ہے جو طالع کی شامت ہو
میں اپنے واسطے کہتا نہیں پیارے، پر عاشق کو
نہ اتنا تنگ کر جس کا مآل آخر ندامت ہو
رکے سینے میں کیونکر تیر اس نالے کا اے ناصح
کہ کم کاغذ سے جس کے آگے گردوں کی ضخامت[1] ہو
ترے کوچے میں پیارے ان دنوں ہے غیر کی جاگہ
خدا جانے کہ یاں اب کس طرح اپنی اقامت ہو
ہوا جو تجھ پہ قائمؔ تھی سزا کردار کی تیرے
نہ کہتا تھا میں اُس بیگانہ خو سے آشنا مت ہو

---

[1] ل: ضخامت

## ۵

جو دیں ناخن تجھے ناداں، نہ ہو زنہار بالیدہ
مبادا جوں ہلال عقدہ ہو اس ناخن میں پوشیدہ[1]

جو کچھ چاہے سو کر خوشنودیِ حق کا ہوں میں ضامن
پر اتنا دیکھیو تجھ سے کوئی دل ہو نہ رنجیدہ

ہوئی قیمت دو چند اس چشم کی آنکھیں چرانے سے
غلط کہتے ہیں یہ ارزاں بکے ہر مالِ دزدیدہ

زوالِ حسن میں دیکھو خط اُس کے منہ پہ چڑھتا ہے
یہ سچ ہے رو نہ دیجے اس کو جو ہو نا تراشیدہ

تری فرقت میں پیارے رو دیئے غیروں کو کیا یاں تو
ہے میرے خون کا پیاسا اگر دل ہے دگر دیدہ

مری تشخیص مثلِ نقطۂ موہوم مشکل ہے
ہوا ہوں بسکہ سختی سے زمانے کی میں کاہیدہ

کسو نے یہ ستم قائمؔ کہیں دیکھا ہے آنکھوں سے
اگرچہ اور بھی دیکھیں ہیں تیں لاکھوں ستم دیدہ

---

سرسری سمجھی کوئی جاتی ہے حرفِ دل کی تہ[2]
سُن تہِ دل سے کہ تجھے تو مرے حاصل کی تہ

وحشت آور ہے دوانے کی ترے یہ گفتگو
سُن کے جس کی ایک بات اڑ جائے سو عاقل کی تہ

تہ ہے آبِ رواں اور تن ترا غافل کنار
دمبدم خالی کرے ہے موج اس ساحل کی تہ

عشق میں ہے آدمی کا خاکساری سے نباہ
آنچ پر رکھتے ہیں دیگِ گل کو دے کر گِل کی تہ

نہیں ازل کے جو ملے کس کے ملائے سے ہوں صاف
مل کے کب یکتی کرے تیں زور سے انمل کی تہ

معدنِ یاقوت ہے کوچے کی تیرے سب زمیں
بسکہ واں ہر سو جمی ہے خونِ صد بسمل کی تہ

شمع چھپ سکتی ہے کوئی پوششِ فانوس میں
کب ہو قائمؔ حاجب اس کی پردۂ حائل کی تہ

---

[1] ل: میں اس مصرع پر "نسخہ" لکھ کر حاشیے میں یہ مصرع درج ہے: کہ ہو جوں ماہِ نو عقدہ نہ اس ناخن میں پوشیدہ

[2] ل: سرسری

شیخ جی تم نے نہ سمجھا یہ کرامات کی راہ — کیا قباحت ہے نکلنے میں خرابات کی راہ

کہہ کے آنے کو بھلے رات گئے تم کہ میاں — اب تلک تکتے ہیں یاں بیٹھے ہم اُس بات کی راہ

دفن اگر کیجے مری نعش کو واں بہتر ہے — جس طرف سے ہو مرے قبلۂ حاجات کی راہ

کام تو ابرِ مژہ سے بھی نکلتا ہے مرے — کاہیکو دیکھے ہے دہقاں یوہیں برسات کی راہ

کون یاں بوسے کا طالب ہے کسو کے پیارے — پر کبھو کہہ تو جھکیں آپ مدارات کی راہ

بچ کے چیونٹی سے گزر پیل سے چاہے جو نجات — جو عمل یاں ہے، سو دیکھے ہے مکافات کی راہ

چھپ کے جانا تو رہا کوچے میں اُس کے قائمؔ
وضع اب کیجے کوئی اور ملاقات کی راہ

---

جی میں چہلیں تھیں جو کچھ سو تو گئیں یار کے ساتھ
سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کی، سو چلے
بلبلو، خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ

خارِ مردودِ چمن مجھ کو کیا روزِ ازل
جن نے بھیجا ہے تجھے گونۂ گلنار کے ساتھ

یارو کہتے تھے جو تم لالہ و گل ہے، سو کہاں
سر پٹکنے تو نہ آیا تھا میں کہسار کے ساتھ

میں دوانا ہوں صدا[1] (کا) مجھے مت قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

---

[1] کذا۔ بظاہر "سدا" کا محل معلوم ہوتا ہے۔

ہاۓ صیاد، یہ انصاف سے تیرے ہے بعید
یاں تلک کیجے ستم اپنے گرفتار کے ساتھ
گرچہ بلبل ہوں میں قائم ہوۓ اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گل کو جہاں خار کے ساتھ

---

آج اگر بزم میں ہے کچھ اثرِ پروانہ — اُڑتے ہیں پاۓ لگن چند پرِ پروانہ
آتشِ عشق میں جلنا نہیں کارِ آساں — ہر مگس سے نہ طلب کر جگرِ پروانہ
وضع پر اپنی ہے یاں شادی و غم ہر اک کا — شامِ ماتم سے ہے کیا کم سحرِ پروانہ
کیا لکھوں سوزِ دل اپنے سے اسے اے قاصد — جاۓ کاغذ ہوں اگر بال و پرِ پروانہ
شمع تک جاتے تو دیکھا تھا ہم اُس کو قائمؔ
پھر نہ معلوم ہوئی کچھ خبرِ پروانہ

---

کیجے نہ صلح پھر دلِ بے مدعا کے ساتھ — ان بن ہے کچھ قبول کو اپنی دعا کے ساتھ
دوں ہمسری میں بیٹھ کے کس ناسزا کے ساتھ — یاں بحث کا دماغ نہیں ہے خدا کے ساتھ
کیا بانکپن کہوں تری زلفوں کا میں کہ شوخ — ٹک رُو پھرے تو تو آج یہ اُلجھیں ہوا کے ساتھ
خونابِ دل سے ہاتھ ملا ہو تو جانیے — پنجے کیے (ہیں) آپ نے اکثر حنا کے ساتھ
نے جاۓ کیوں نہ آنکھ لڑانا ترا ہمیں — پرواز برگِ کاہ کو ہے کہربا کے ساتھ
اُس حُسنِ تیرہ رنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ — ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ
کس زلفِ مشکبار کی لٹ کھل گئی ہے آج — اُڑتی پھرے ہیں طیب کی لپٹیں صبا کے ساتھ

---

۱؎ ل: پھر

موتی صدف سے نکلے ہیں قائم کب اس طرح — ڈھلتی ہے بات منہ سے ترے جس صفا کے ساتھ

قائم، سمجھ کے بولیو نواب سے کے حضور
پیارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ

---

جاتے ہی ہو گر خواہ نخواہ — فبہا، بہتر، بسم اللہ
یک شب دیکھی جن نے وہ زلف — لاکھوں دیکھے روزِ سیاہ
آتی تو مت ہو جلد نسیم — ہم بھی چمن تک یاں ہمراہ
دشمن رہویں بادہ بغیر — تا ہے خرقہ اور کلاہ
کوندے ہے دل پر برق سی آج — پیشِ نظر ہے کس کی نگاہ
وعدہ کر کے رات کا تم — خوب ہی آئے واہ جی واہ

قائم سے کوئی ہو ہے خفا
بندہ، خادم، دولتخواہ

---

مت پوچھ دل کی کیونکے کٹی درد و غم کے ساتھ — جوں آئینہ سفید تھا ہر ایک دم کے ساتھ

---

شیخ* جو تمھارا آشنا گر ہے وہ — مرا دل ہے پر سخت کافر ہے وہ
کرے گو کہ اعمال عیسیٰ کے شیخ — میں پہچانتا ہوں اسے خر ہے وہ
بہے جو چشم تر بہرِ ابنِ علی — بہ از چشمۂ آبِ کوثر ہے وہ
دکھیوں غیر کو مجھ پہ ترجیح ہو — ہے نو آمد البتہ بہتر ہے وہ
کہیں جو ہیں قائم کی ہمت کے لوگ — میں واقف ہوں اس سے قلندر ہے وہ

---

* یہ غزل ق، میں نہیں ہے۔

# ی

نہ ہم فلک سے کبھی [illegible] رنگ سے چھوٹے
پڑے بھنور میں جو کام نہنگ سے چھوٹے

کرے ہے اس کو زمانہ اسیر پنجۂ باز
جو مرغ دل کبھو شاہیں کے چنگ سے چھوٹے

نہ ہم کو ملنے سے [illegible] کے منع کر ناصح
کہ عشق شمع کا کیونکر پتنگ سے چھوٹے

نہیں بتاں کے مناسب ہر اک سے لگ چلنا
خدا کرے کہ یہ ڈھنگ اس کے ڈھنگ سے چھوٹے

شتاب ہم کو رہا کر، کہ فصل گل صیّاد
خزاں ہو اس میں جو ہم ٹک درنگ سے چھوٹے

رہے ہے خوار گرفتارِ نام و ننگ سدا
بھلا ہوا کہ ہم اس نام و ننگ سے چھوٹے

نہ اس کی زلف سے چھٹنے کا قصد کر قائمؔ
کوئی سنا ہے کہ قیدِ فرنگ سے چھوٹے

---

خط کے آتے ہی وہ مکھڑے کی صفائی کیا ہوئی
وہ منش کیدھر گئی، وہ میرزائی کیا ہوئی

ہم نہ کہتے تھے کہ پیارے جان اہلِ دل کی قدر
اب وہ دل کیدھر گئے، وہ دلربائی کیا ہوئی

زور کرتا ہے اک عالم ناتوانوں پر ترے
اے سپہرِ دوں تری زور آزمائی کیا ہوئی

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

رو دیئے اس غمکدے سے آہ کس کس کو کہ یاں
دیکھتے نظروں کے اپنی اک خدائی کیا ہوئی

اے وفا بیگانہ تھا تو بھی تو ہم سے آشنا
وہ وفا کیدھر گئی، وہ آشنائی کیا ہوئی

گو کسی حالت میں ہو قائمؔ میں سمجھوں ہوں تجھے
ہے تو تو وہی، یہ تیری کبریائی کیا ہوئی

---

نام الشیخ جیو

جوں موجِ مرا قافلہ غافل ہے سفر سے — کیا جانیے کہاں جائے گا، آیا ہے کیدھر سے
ہاتھوں سے زلیں مردمِ بدبیں کے ہوا داغ — جوں تِلی میں چھپتا ہوں اب اپنی بھی نظر سے
کس رات میں جوں گل نہ ہوا غرق لہو میں — کس دن نہ بھری گود مری لختِ جگر سے
وہ خارِ یتیمی زدہ اس دشت میں ہوں میں — پالا ہے جسے آبلے نے خونِ جگر سے
سر کھینچے اگر عرش تلک تو بھی بجا ہے — شرمندہ نہیں آہ مری لیڑوے اثر سے
اپنے سے بھی یاں چارے کی اُمید غلط ہے — کب اپنی گرہ کھلتی ہے دندانِ گہر سے
وا کون کرے عقدہ کسی کا کہ جھٹ اپنے — کھلتے میں گرہ دیکھی نہ دندانِ گہر سے
[1]اے خلوتیاں! شیخ کا احوال سُنا کچھ — کہتے ہیں گرے راہ میں تکیے کی وہ خر سے
مانندِ نگیں چاہے اگر نام کو قائمؔ
باہر نہ قدم رکھیو مری جان تو گھر سے

---

قتل پہ میرے تجھے کد چاہیے — خوب ہے یہ، اپنے کا بد چاہیے
زلف کے کوچوں کی درازی نہ پوچھ — چلنے کو واں عمرِ ابد چاہیے
دل کی میں کرتا نہیں جھوٹی صلاح — مال ہے سرکار کا، جد چاہیے
فوج کی ہے اشک کے حالت تباہ — آہ سے اس وقت مدد چاہیے
شیخ کی عزت ہے من الواجبات — کفش نہ ہوئے تو لکد چاہیے
پشم ہے یاں مسندِ قاقم کا فرش — گھر میں فقیروں کے نمد چاہیے
پس رہِ واحد ہو، کہ مرنا ہے کل — راہِ ندیدہ کو بلد چاہیے
ہم سے یہ کیا ناخوش و قائمؔ سے خوش
جو ہو میاں، حصّہ رسد چاہیے

---

[1] یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

خوگرِ درد ہوں میں گو کرتے ہیں درماں میرے ‏ آہ کیوں درپے جاں ہیں یہ عزیزاں میرے
اے غم و درد و الم عام ہے اس گھر میں صلا ‏ جس کو جاگہ نہ کہیں ہووے مہماں میرے
ہوں میں وہ گبر کہ اسلام میں ہو رہزنِ دیں ‏ وضع پر جائیو مت کوئی مسلماں میرے
ایسے بیرحم سے جا ہوں ہوا میں یوں لگا کام ‏ دایم اس عزم اوپر ہنستے ہیں حرماں میرے
میں گرفتارِ بلا قصدِ چمن کیونکے کروں ‏ یاں تو قسمت میں ہے یکچند یہ زنداں میرے
کثرتِ اشک سے دیکھا بھی ہوا اسکو جو میں رات ‏ پھوٹیں اے مدعی یہ دیدۂ گریاں میرے
ہر گلی کوچہ ہے بستی کا پراچے (کی) دکاں ‏ دھجیں ہو کے اڑے بسکہ گریباں میرے
رہئے آسودگی کس طرح میں دیکھوں قائم
یاں کہ درپے ہیں ہزاروں دلِ ناداں میرے

---

کب شمع یوں گدازِ محبت میں گل سکے ‏ کیا تاب ہے پتنگ کی اس طرح جل سکے
کثرت اگر یہی ہے گلی میں تری تو شوخ ‏ ممکن نہیں کہ تیغ چھٹ اور کوئی چل سکے
سودائے زلف جائے ہے کوئی دماغ سے ‏ یہ وہ بلا نہیں ہے کہ جو سر سے ٹل سکے
اے گریہ کب کہا میں گرہ در گلو نہ ہو ‏ پر اس قدر تو دے راہ کہ ٹک جی نکل سکے
قائم کے حال سے ہے تعرض عبث کہ چرخ
ایسا گرا نہیں وہ کہ تجھ سے سنبھل سکے

---

آشنا ہوجیو مت ہجر کے کوئی غم سے ‏ گو کہ سختی میں وہ دل سنگ کے ہو عالم سے
شورِ دیوار کے گرنے کا سنا ہے کہ نہیں ‏ نالہ کرتی ہے ہر اک خشت فراقِ ہم سے
حالِ دل کا تو عبث پوچھے ہے مجھ سے ناصح ‏ یہ سخن کہیے گا ناداں تو کسی محرم سے
یار جب نوح کے طوفاں کا کرتے ہیں چرچا ‏ ایک رشحہ تھا وہ اپنے مژۂ پرنم سے

جزوکشِ نسخۂ دل کون سا ہے طفل کہ آج — پھیر دیکھوں ہوں یہ اوراق میں کچھ درہم سے
اے ہوا خواہ! اسے سوزنِ الماس سے ٹانک — زخمِ دل ہے، یہ بھلا ہوہے کہیں مرہم سے
روزِ عشرت کا کبھو رکھتے تھے ہم بھی قائم
لیکن ایسا کہ جو مانا تھا شبِ ماتم سے

---

کیا اختلاط ابھی تمھیں اغیار ساتھ ہے — ڈریے خدا سے ٹک، یہ گنہگار ساتھ ہے
چیں بر جبیں تو ہوئے ہو شانے کے کھینچتے — حیف اس پہ جس کی جان ہر اک تار ساتھ ہے
اک حرف ہے جو سنیے، یہ کوئی کہے سو کیا — یاں تو ہر ایک بات کے تلوار ساتھ ہے
رو سے نقاب کس کے اٹھا یہ کہ تا ہنوز — حیرت سے پشت آئنہ دیوار ساتھ ہے
بوسے کی گر طلب سے خفا ہو تو کیا ہوا — اس خشمگیں نگاہ کے اک پیار ساتھ ہے
شادی سے تو اماں ہے غم اس دہر میں کہ دیکھ — جو روزِ خوش ہے اس کے شبِ تار ساتھ ہے
قائم نہیں ہے دردِ محبت دوا پذیر
تا جان ہے، یہ جان کے آزار ساتھ ہے

---

پاس میں تجھ غم کے ہم اپنی بھی غمخواری نہ کی — جان تک گزری، یہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی
دستِ رد کس مشتری نے اس کو مارا ہے کہ یاں — جنس کی دل کے کسو نے پھر خریداری نہ کی
دم بہ دم اس رنجشِ بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ — دل دیا تجھ کو تو کچھ ہم نے گنہگاری نہ کی
بعد خط آنے کے تھا اس سے وفا کا احتمال — لیک تاں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی
پشت دی تنہا نہ مجھ کو مردمِ دیدہ نے یاں — جن نے دیکھا رو ترا میری طرفداری نہ کی
عذر چاہا بعد خط کے ان نے ہر اک سے ولے — اک دلِ ناشاد کی میرے ہی دلداری نہ کی
دیکھیے بھٹکاو کیا قسمت میں ہیں قائم کہ یار — لاد ٹانڈا چل بسے، اب تک میں تیاری نہ کی

---

زبسکہ رات اذیت تھی عشق کے تب کی — میں کیا کہوں کہ سحر کن دکھوں سے میں شب کی
رویا تو تھا غمِ یوسف میں پیرِ کنعاں بھی — پہ کی جو زاری میں تجھ بن کسو نے وہ کب کی
بھلا گیا تھا تو پڑھنے کے واسطے کہ ہنوز — پٹی پڑی ہے اک عالم سے راہ مکتب کی
خیالِ بوسہ کیا کس سیاہ دل نے کہ آہ — دمک ہے نیل کی سرخی میں آج تجھ لب کی
سوائے دل شکنی سب مباح ہے یاں شیخ — خبر نہیں تجھے رندوں کے دین و مذہب کی
اگرچہ صبح تلک ہمدگر تھے گرمِ سخن — پہ کہہ سکا نہ کچھ اُس سے میں بات مطلب کی
اُٹھا نہ در کے مقابل سے پھر وہ خستہ کبھو — نظر پڑی جسے پردے سے ٹک تری چھب کی
حباب تو ہے گہر کا بھی آبدار، پہ شوخ — نہ اس قدر کہ جو صافی ترے ہے غبغب کی

سوالِ بوسہ جو قائمؔ کیا میں شب، تو کہا
کہ کیجے چھیڑ کہیں اور جا کے اس ڈھب کی

---

گہ پیر شیخ و گاہ مرید مغاں رہے — اب تک تو آبرو سے نبھی ہے جہاں رہے
دنیا میں ہم رہے تو کئی دن، پہ اس طرح — دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے
اے دیدہ، دل کو روتے ہو کیا تم، ہمیں تو یاں — یہ جھینکنا پڑا ہے کسی طرح جاں رہے
قسمت تو دیکھ، بار بھی اپنا گرا تو واں — جس دشتِ پُر خطر میں کئی کارواں رہے
صحبت کی گرمی ہم سے کوئی سیکھے مثلِ شمع — سارے ہوئے سفید، پہ تو بھی جواں رہے
مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا — قائمؔ وہ میفروش کی اپنے دکاں رہے

قائمؔ اسی زمیں کو تو پھر کہہ، پہ اس طرح
سن کر جسے کہ چرخ میں نت آسماں رہے

---

صبر و قرار و ہوش و دل و دیں تو واں رہے — اے ہم نشیں یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے

صیّاد شورِ نوحہ کچھ آنے لگا ہے کم
یاروں کے دود ہم سے مگر آشیاں رہے

تو تو چلی بہار پہ آنے[۱] کی بھی کچھ خبر
جو[۲] سر بجیب غنچۂ نشگفتہ ساں رہے

کوئی کہے یہ جا کے سگِ کوے یار سے
لیجائیں ہم کہاں جو یہ اب استخواں رہے

پیارے ہمیشہ ایک سی رنجش ہو کچھ بھی لطف
ناخوش کبھو ہوئے تو کبھو مہرباں رہے

کرتے[۳] جو چاہے آج تو نام و نشاں کی فکر
کل ہے کہ نے یہ نام رہے اور نشاں رہے

قائم کو اپنی بزم سے جانے[۴] نہ دے کہ یار
ہے کیا پڑا[۵] جو مفت میں اک شعر خواں رہے

قائم ترے کو اُس سے ہزاروں ہیں چشم داشت
یارب ہو تا جہاں اسد یار خاں رہے

---

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے
شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے

ہم نشیں ذکرِ یار کر کہ کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے

دل مژہ تک پہنچ چکا جوں اشک
اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے

ساقیا دور کیا کرے ہے تمام
آپ ہی اب یہ دور چلتا ہے

گندمی رنگ جو ہے دنیا میں
میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

ہے تواضع ضرور دولت کو
ہو ہے خم جو نہال پھلتا ہے

اپنے عاشق کی سوخت پر پیارے (ق)
کبھو کچھ دل ترا بھی جلتا ہے

دیکھ کیسا پتنگ کی خاطر
شعلۂ شمع ہاتھ ملتا ہے

آج قائم کے شعر ہم نے سُنے
ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

---

۱ ل: اُس کی
۲ ل: جوں
۳ ل: کریے
۴ م: جلنے نہ دو
۵ م: ہے کیا بُرا

آؤ کچھ شغل کریں، بیٹھے ہیں عریاں اتنے
پھاڑیں سینہ ہی گو ہاتھ آئے گریباں اتنے

آہ کوئی جو اسے آن کے سمجھاتا ہو
دیکھتے ہیں کھڑے ہندو و مسلماں اتنے

سچ کہہ اے بادِ صبا، ہے کسی گل پہ یہ بہار
تو نے دیکھیں ہیں زمانے کے گلستاں اتنے

شورِ محشر کا ہے کیوں نہ ترے کوچے میں
جس جگہ ہوئیں اکٹھے دلِ ناداں اتنے

ہم سے واماندوں کو اللہ نباہے تو نبھیں
تن سو یہ خستہ و در پیش بیاباں اتنے

دم بھی کچھ چیز ہے جب چوک گیا بات تمام
کون سی زیست پہ کرتا ہے تو ساماں اتنے

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا اے امیر
مجتمع سایے میں ہیں جس کے سخنداں اتنے

---

ہر چند دکھ دہی سے زمانے کو عشق ہے
لیکن مرے بھی تاب کے لانے کو عشق ہے

آشفتہ سر ہیں یاں دلِ صد چاک بھی کئی
تنہا نہ تیری زلف سے شانے کو عشق ہے

افلاک بیٹھے جائیں تھے جس بوجھ کے تلے
آدم کے ویسے بار اٹھانے کو عشق ہے

وحشت کو اپنی شہر و بیاباں میں جا نہیں
عاقل کو اب دعا و دوانے کو عشق ہے

یارب بن آئے آدمی مر جائے، پر نہ ہو
وہ رنج بد بلا جو کھانے کو عشق ہے

دل کو چھڑا دہن سے پھنسایا تو زلف میں
اے عشق تیرے بات بڑھانے کو عشق ہے

قائمؔ ہوس سے گو کہ کہی سب نے یہ غزل
لیکن ترے ردیف بٹھانے کو عشق ہے

---

ارمغاں لیتے کئی زخمِ نمایاں کو گئے
رات جو چاک مرے جیب سے داماں کو گئے

کاسۂ چشم مرا اب بھی ہے طوفاں کا تنور
گرچہ اک عمر ہوئی دیدۂ گریاں کو گئے

شورِ شیون ہے چمن بیچ مگر باد کے ساتھ
مشتِ پر آج مرے صحنِ گلستاں کو گئے

اپنے گلشن میں صبا سے نہ بندھے نقشِ طرب
عمر یاں گزری ہے گل کے لبِ خنداں کو گئے

موئے پروانہ شبِ تارِ لحد سے ان کو
داغ دل سے جو لیے ساتھ چراغاں کو گئے

اوّل اس درد میں مر لیجیے کہ تا خلق کو بات
ہو نہ کہنے کو کہ جی کے لیے درماں کو گئے

خبط سے دعویٰ سودا ہے اب ان یاروں کو
وہ جو دیوانے تھے تیرے سو بیاباں کو گئے

سنگِ رہ اپنی ہی کم ہمتی ہے یاں ورنہ
جو چلے سیل کی مانند سو عمّاں کو گئے

فارسی کہنی بر افتادہ ہی ہو گی قائمؔ
رفتہ رفتہ جو ترے شعر صفاہاں کو گئے

---

یاں سدا نیشِ بلا وقفِ جگر ریشی ہے
کیجے کیا جان مری عالمِ درویشی ہے

اپنے مذہب میں قرابت نہیں اجداد کی شرط
تجھ سے نسبت ہے جسے اس سے ہمیں خویشی ہے

مجھ سے اک خستہ سے ناحق یہ شب و روز خلش
اے جفا پیشہ یہ کیا نحوِ ستم کیشی ہے

بات ہے شہرہ نصیبی کی ترا لی ورنہ
مجھ پہ کس چیز میں مجنوں کے تئیں بیشی ہے

[1]گنجے سر پر نہیں زاہد کے کچھ اک موئے سفید
یہ خدا کی انھیں بخشی گلہ پیشی ہے

گوہرِ اشک کو نشمردہ تو قائمؔ نہ بکھیر
آدمی ہے و میاں عاقبت اندیشی ہے

---

دل سے کچھ آج ترا دندہ نیا مضموں ہے
مصرعِ آہ جو سر کھینچے ہے سو موزوں ہے

کاش اس وادی میں اے ناقۂ لیلیٰ تیرا
اُس طرف راہ غلط ہو کہ جدھر مجنوں ہے

میں ہوں رسوائے جہاں وضع سے اپنی ورنہ
جو کوئی اہلِ نظر ہے سو کہیں مفتوں ہے

دیکھ اے چشمِ نمِ اشک سنبھالے ہی رکھ
ٹک جھپک جائے گی مژگاں تو یہ پھر جیحوں ہے

---

[1] یہ شعر ل میں نہیں ہے۔

خوان سے چرخ کے نعما کی توقع ہے غلط — جب سے دیکھوں ہوں میں یہ کاسہ یوہیں وارونہ ہے
تہمتِ کینہ فلک پر ہے بھلانے کے لیے — ورنہ جو دل ہے ترے جور سے یاں پرخوں ہے

جی کو کچھ ماننے ہی بنتی ہے نہ جانے قائمؔ
ہر سخن منہ کا ترے سحر ہے یا افسوں ہے

---

اس دل کی خو ہے رو کے اٹھے سر پٹک پڑے — سچ ہے کہ وہ نہ چھوٹے کسو کا جو ٹک پڑے
ظاہر ہے آئینے میں ترے حسن کا شکوہ — پانی میں ماہتاب کی جیسے جھلک پڑے
تھا رات سوزِ دل کا مرے بزم میں بیاں — بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے
عاشق کے گھر خدا نہ کرے جاؤ تم پر آج — کیا جانے کیا کرم تھا جو ادھر بھٹک پڑے
پیتے تو گھر ہے لیک میں کہتا نہیں میاں — کیا جانے کیا کسو کی طبیعت میں شک پڑے
زخمِ جگر کا اس سے مجرب نہیں علاج — الماس کے جو سودے میں تھوڑا نمک پڑے
پہنچا سرشکِ چشم میں، اے ضبط رکھ نگاہ — پیالہ یہ بھر چکا ہے مبادا چھلک پڑے
ناآشنا سودۂ زخمِ جگر کو دے کیا مزہ — تھوڑا سا ذائقے کو نہ جب تک نمک پڑے
غافل بہارِ عمر کی آخر ہے، پی شراب — پیمانہ بھر چکا ہے مبادا چھلک پڑے
تاعمر یا تحفہ بیٹھ کیا چند روز میں — یارب سو بسر کیے نہ پیچھے فلک پڑے

قائمؔ تو وقتِ گریہ دلِ زار کو سنبھال
ایسا نہ ہو کہ مل کے لہو میں ٹپک پڑے

---

اے گریہ دعا کر کہ شبِ غم بسر آئے — تاچند ہر اک اشک کی تہ میں جگر آئے
ہر لحظہ ہے ناچاقی و ہر دم خفگی یاں — اس نازکے عہدے سے کوئی کیونکے بر آئے

---

لہ یہ شعر ... میں نہیں ہیں۔

آئینے پہ کیا حصر ہے جو تجھ سے کو دیکھے — البتہ کہ آب اس کے دہن بیچ بھر آوے
قاصد تو گیا اس کی خبر لانے کو لیکن — دل دھڑکے ہے کیا جانیے کیسی خبر آوے
تیاری ہی میں گھر کی میں رہتا ہوں شب و روز[۱] — اس سوچ میں شاید وہ کبھو بے خبر آوے
دل خط سے نکل، زلف ہی میں اس کی پھر آیا — بھولا نہیں وہ شخص جو شب کو بھی گھر آوے
قائمؔ تری سب عمر کٹی لہو (و) لعب میں
اے وائے براوقات کہ جو یوں بسر آوے

---

تا شوخیِ نگاہ تری گرمِ ناز ہے — میدانِ سینہ پیشکشِ ترک و تاز ہے
معنی نہ آئیں درک میں غیر از وجودِ لفظ — آرے دلیلِ راہِ حقیقت مجاز ہے
شامت ہے کیا کہ شیخ سے کوئی ملے کہ واں — روزہ وبالِ جاں ہے سدا یا نماز ہے
بوسہ دے گیا تو غیر کے دھوکے میں شب مجھے (کذا) — لیکن ہر اک کسی کا خدا کارساز ہے
جوں مومِ تفتہ کس کو سنبھالے ہی تو کہ یاں — جتنا بدن ہے آتشِ غم سے گداز ہے
ڈرتا ہوں میں کہ شیخ الجھ کر گرے نہ کہیں — یہ پستہ قد و ریش نہایت دراز ہے
قائمؔ کرے ہے کس سے تو اظہارِ دردِ دل
اے بے شعور، کچھ بھی تجھے امتیاز ہے

---

نے ناز و عشوہ ہے، نہ تقطیع نہ چھب ہے — دل کو جو لبھا لے ہے وہ کچھ اور سبب ہے
یہ شوخی و ناز اور کسی شوخ میں کب ہے — شوخی یہ نہیں، قہر ہے، آفت ہے، غضب ہے
سوتے میں ترے بخت ہوس جاگے تو کس کام — یاں طالعِ خوابیدہ کو تو پاسِ ادب ہے
آئینے کو ٹک چوم کہ ہو صاف یہ عقدہ — یعنی ہے جگہ بوسے کے لینے کی تو لب ہے

---

[۱] م، تیاری میں گھر کی ہی میں

یاں ڈھب تو ڈھبانے کے بہت یاد ہیں لیکن　　کیا کیجے کہ اس بت کی ملاقات کڈھب ہے
بات اُس سے کہا میں کہ ترے کوچے میں پیارے　　(ق)، قائم کو بہت دیر ہوئی داد طلب ہے
کیا ہو جو ٹک اک سن لے تو احوال کو اس کے　　بولا کہ ترے فہم سے یہ بات عجب ہے
ہو ایک ستمکش تو کوئی داد دے، یاں تو
لے صبح سے تا شام یہی شور و شغب ہے

---

فلک نے چند کو منزل دی مجھ کو دوانے کی　　کی بارے فکر اس اوجڑ کے بھی بسانے کی
زبس کہ یار نے خلوت کو بارِ عام کیا　　خبر کہے ہی ہر اک بے خبر ٹھکانے کی
کبھو ہمیں بھی کہ آتا تھا دردِ دل اُس سے　　پر اس طرح کہ شکایت میں کچھ زمانے کی
وہ طفلِ شوخ ہے صیاد یاں مرا جن نے　　اسیر کر کے خبر لی نہ آب و دانے کی
دلا نہیں ہے کچھ اتنی تو اس کی صورت و شکل　　مگر یہ کہ کہ نرالی ہے بات بھانے کی
خدا نہ کردہ اسے غیر سے تو کیا سروکار　　تھی ایک بات ہمارے ہی یہ جلانے کی
برنگِ نقشِ قدم ہوں میں یاں وہ خاک نشیں　　کہ فکر کی نہ کسی نے مرے اُٹھانے کی
کیا گلی سے تری چشم بر قفا قائم
مگر اُمید نہ تھی اس کو پھیر آنے کی

---

جب میں دیکھا ہے تو اس دل کو غمیں دیکھا ہے　　یہ نیا چاؤ محبّت کا یہیں دیکھا ہے
حسرتِ دل کو مری سمجھے ہے وہ خستہ جسے　　یار نے آ کے دمِ بازپسیں دیکھا ہے
کو سکندر کی سی ہمّت کہ پھر آتشنہ، اگر　　موج سے آبِ خضر چین بجبیں دیکھا ہے
میری سی طرح کچھ حیران تو آتا ہے نظر　　سچ کہہ اے آئینہ تیں کس کے تئیں دیکھا ہے
اے کہ مجھ دل شدہ کا حال تو پوچھے ہی کہیں　　تو نے احوالِ مکانِ غیر مکیں دیکھا ہے

جائے آسودگی پیدا نہیں گردوں کے تلے    کر کے میں سیر یہ سب روئے زمیں دیکھا ہے
یک شناسائی ہمیں بھی تھی طرب سے قائم
لیکن ایسی کہ جسے کہیے کہیں دیکھا ہے

---

نہ پوچھو کیونکے میری ان دنوں اوقات کٹتی ہے    کہ دن گر رو کے گزرے ہے تو مر کر رات کٹتی ہے
ہیں عاشق اور بھی لیکن جو تجھ بن مجھ پہ گزرے ہے    کسو کی زیست کا ہے کو بایں آفات کٹتی ہے
لجھو حاصل حال میرا پوچھنے سے آپ خوش رہیے    مری بھی ہر طرح سے قبلۂ حاجات کٹتی ہے
برس گزرے کہ ہے بارش مرے مژگاں کی ویسی ہی    غلط ہے یہ کہ بعد از چند مہ برسات کٹتی ہے
پھنسا ہے زلف میں قائم تو مت اس خط سے ہو غافل
کہ غیر از خضر کے کوئی رہِ ظلمات کٹتی ہے

---

ہنوز شوقِ دلِ بیقرار باقی ہے    بجھی ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے
شرابِ عشق میں کیا جانے کیا بلا تھی ملی    کہ جس کے کیف کا اب تک خمار باقی ہے
گئی نہ ہم سے اضافت وجود کی کہ ہم آپ    جو اب نہیں تو ہمارا غبار باقی ہے
غلاف کیجو نہ تیغِ ستم کو تیں کہ میاں    ابھی جوارِ حرم میں شکار باقی ہے
گیا تھا آج میں قائم کے دیکھنے کے لیے
کوئی دم اور نفس کی شمار باقی ہے

---

خدا ہی حافظ اس مژگاں کی ہے شوخی و شنگی سے
پڑا ہے کام مجھ کو بے طرح کی فوجِ جنگی سے
نہ زخمِ سینہ سی کر اور مجھ کو تنگ کر ناصح
کہ دم اپنا سما سکتا نہیں پہلے ہی تنگی سے

عبث ہے بادہ دینا زاہدانِ تیرہ باطن کو
کوئی دھونے سے پانی کے سیاہی جاہے زنگی سے

شعور اتنا تو کیا گردونِ دوں فطرت میں ہے لیکن
یہ سفلہ پیش لیجاتا ہے اپنی غولہ دنگی سے

میں چشمِ مست دخطِ سبزِ خوباں جب سے دیکھا ہے
تعصب ہے نہ اب میکش سے نے انکار بنگی سے

حقیقت میں نہیں نقش ونگار اتنے تو یاں قائم
دکھائی دیں ہیں جو تجھ کو زمانے کی دورنگی سے

نہ ہوئے پیش نظر تیرے اگر شیشہ یہ پتلی کا
تو کم ہے یہ فضائے دہر صندوقِ فرنگی سے

---

جو بو کچھ اور بھری ہو دماغ میں گل کے
کہوں کہ وہ ابھی لیتے لے باغ میں گل کے

ہے کیا خوشی کی جگہ اس ریاض میں کہ جہاں
مدام خونِ جگر ہو ایاغ میں گل کے

چمن بھی گورِ غریباں سے کم نہیں کہ کبھو
نہ تیل دیکھا نہ پانی چراغ میں گل کے

عجب مزا ہے چمن بیچ پر ہزار افسوس
کہ صبح وشام ہیں گل چیں فراغ میں گل کے

کرے ہے خلق عداوت کو دوستی سے بدل
نہ ضو ہو باد سے کیونکر چراغ میں گل کے

گل[لہ] گلاب ہے شیشے میں غنچے کے تس پر
لہو جگر کا ہے تجھ بن ایاغ میں گل کے

نہ دیکھ سرسری اوراقِ گل کہ یاں قائم
ہے شرحِ تنگیِ غنچہ فراغ میں گل کے

---

لہ یہ شعر 'ل' میں نہیں ہے۔

یوہیں جو یہ چشم تر رہیں گے　　عالم کو خراب کر رہیں گے
تسکین دی دل کو پشتِ خم نے　　یعنی پل ہے، اُتر رہیں گے
کہیو تو صبا کہ ہم صفیرو　　ملیے گا جو بال و پر رہیں گے
گو ساقی نہ مے دے، ہم بھی ہر طرح　　پیمانۂ عمر بھر رہیں گے
کیا لطف ہے زندگی کا پیارے　　یوں غیر جو ہم پہ وَر رہیں گے
مارا جو نہ جائے گا کسی کو　　اتنا تو ہے آپ مر رہیں گے

بس کی ہی ہے عاشقی جو قائم
باتوں سے ہم اس کی ور رہیں گے

---

آج جی میں ہے کہ کھل کر مے پرستی کیجیے
خوب سی مے پیجیے اور دیر مستی کیجیے
زہدِ خشک آخر کہاں تک مایۂ تر دامنی
غرق لائے مے بھی چندے رختِ ہستی کیجیے
تنگ تر ہے دستِ حاجت سے دلِ ابنائے دہر
کس کے آگے ظاہر اپنی تنگ دستی کیجیے
درپے ویرانیِ دل ہے وہ جو بستا ہے یاں
کس طرح یارب اس اوجڑ گھر کو بستی کیجیے
لب پہ فوارے کے جاری ہے یہ مصرع دمبدم
دے اگر خالق بلندی، میلِ پستی کیجیے
مفت تک دوں ہوں میں دل، تس پہ کوئی لیتا نہیں
ہاں مگر اس سے بھی کچھ یہ جنس سستی کیجیے

ٹک گریباں آج پھٹ کر دھجیں ہو لے تو پھر
چاک پر سینہ کے قائمؔ پیش دستی کیجیے

---

سنبل کو چل کے باغ میں شرمندہ کیجیے — تجھ مکھ پہ یعنی زلف پراگندہ کیجیے
کہتا نہیں میں ترک[1] کر، غیر کا ولیک — ہووے جو اپنی وضع کے زیبندہ کیجیے
عیسیٰ ہیں لب ترے بھی وگر ہو کسی کو شک — ہم سے جو مر رہے ہیں انھیں زندہ کیجیے
عذرِ ستم عبث ہے کہ گزرا وہ جو ہوا — منظور اگر ہے لطف، تو آیندہ کیجیے
یہ لوحِ سادہ دیر سے گردن کا ہے وبال — جی میں ہے دل پہ نام ترا کندہ کیجیے
اتنے ہی گر خفا ہو نہ ملنا، پر اب تو شوخ — کچھ ہنسیے، بات کہیے، شکر خندہ کیجیے

قائمؔ تری غلامی سے نکلا، جو اب کوئی
قابل ہو بندگی کے، اسے بندہ کیجیے

---

کوئی ٹک اس کو حال کی میرے خبر کرے — پر اس طرح کہ دل میں کچھ اس کے اثر کرے
موقوف شغلِ گریہ مری چشم اگر کرے — اتنا ہے نہ پانی کہ لب کوئی تر کرے
پہلے ہی سوجھتی تھی آہیں اے شبِ فراق — یہ رات بے طرح ہے خدا ہی سحر کرے
غافل نہ فکرِ زاد سے رہ[2] تو کہ بے خبر — کیا[3] جانے کب یہ قافلہ یاں سے سفر کرے
صندل ہر گو صداع کو نافع، پر اے طبیب — اتنا کسے دماغ کہ یہ دردِ سر کرے
کیا جانیے یہ باتیں میں سہتا ہوں کس لیے — ایسا ہے ورنہ کون کہ یوں درگذر کرے
گر کیمیا کسو نے بتائی تجھے تو کیا — اُس کی تلاش کر جو ترے مس کو زر کرے

---

[1] م، ترک کہو [2] م، رہنا کہ بے خبر [3] م، کیا جانیے یہ قافلہ کس دم سفر کرے

کوشوں سے آدمی کو جو دیکھا تو کیا ہوا
وہ چشم ہے جو حال پہ اپنے نظر کرے
کہتے ہیں لوگ گالیئں قائمؔ کو دے گیا
اے کاش یہ سلوک وہ بارِ دگر کرے

---

کسے حباب نمط یاں ہوائے افسر ہے
ہے بس جو کاسۂ سر سے کلاہ سر پہ ہے
نہ غم بُرا ہے، نہ عیش و نشاط بہتر ہے
سبھی مساوی ہیں یاں، یہ فقیر کا گھر ہے
ہماری چشم سے سیکھے کرم کوئی کہ سدا
گہر یہ بخشتے ہیں تس پہ بھی شرم سے تر ہے
ہے آہ و نالے سے میرے جہاں پہ عرصہ تنگ
یہ شب ہے ہجر کی یارب کہ روزِ محشر ہے
کرے ہے آئنہ کیا آستین سے تو صاف
ترے تو ہاتھ سے عالم کا دل مکدر ہے
شریکِ چشم اسے کرکے کس کو مارا تیں
یہ بے سبب نہیں سرمہ جو گریہ آور ہے
یہ آہ اس سے نہ دے ہمسری تو کیوں رستم
کسی کے تیر میں سرخاب کا مگر پر ہے
یہ طشت و تیغ یہ ہم کشتنی، و رنگ ہے کیا
یوہیں مزاج میں آئے اگر تو بہتر ہے
[1]ہوں مست و چاک کی ہے پیرہن کے دل میں ہوس
بتائے مجھ کو گریباں کوئی کہ کیدھر ہے
[2]گناہ کرتے ہیں کس سے چھپا کے ہم اے دل
وہ آپ دیکھے ہے جس کا ہمیں بڑا ڈر ہے
[3]تو داوری پہ نہ بھول اپنی اس قدر ناداں
ترے سوائے کوئی اور بھی تو داور ہے
ڈبویا آہ تو قائمؔ مجھے بھی اپنے ساتھ
اے بے خبر میں تو جانا تھا تو شناور ہے

---

سحر ہوئی، رات بیتی، مے ہے شیشے میں وہی باقی
ادر کاساً وناولہا الا یا ایہا الساقی

---

[1] [2] [3] یہ شعر ل میں نہیں ہیں۔

بھو کالی گھٹا میں کوند بجلی کی نہ ہو ایسی
سیاہی میں مسی کی ہے جو اُن دانتوں کی براقی

بھلا ہم رند، زاہد، تجھ سے نیکوکار کیونکر ہوں
ظہورِ مختلف کو چاہتی ہے شانِ خلاقی

مؤدب ہوئے جو معشوق ہم تو اس کے بندے ہیں
اگرچہ دل کش اس فرقے کی ہے شوخی و شلتاقی

بسر ہو جائے پیارے کیونکے کوئی تجھ سے بدخو سے
کہ نت رنجش، ہمیشہ ناخوشی، ہر لحظہ ناچاقی

نہ آنے سے مرے وہ خوش، نہ جانے سے میں ہٹتا ہوں
خدا جانے کرے گی کیا یہ ہر ساعت کی مشتاقی

نہ بے اسبابیِ دنیا سے قائمؔ تنگ ہو اتنا
اگر فعلِ مشیت جانتا ہے وصفِ رزاقی

---

ابریزِ شوق میرا از بسکہ مو بہ مو ہے — سمجھا نہ میں یہ اب تک یہ میں ہوں یا کہ تو ہے
اب آنہ آکہ یاں تک تیرا خیال چھایا — جیدھر نظر کروں میں اودھر تو رو بہ رو ہے
کل کے عوض بھی آج ہی آؤ تو کیا برا ہو — وعدہ خلاف کرنا سرکار کی تو خو ہے
موجِ نفس سے ناداں غافل نہ ہو کہ تیری — یہ ہستیِ دو روزہ نخلِ کنارِ جو ہے
شبنم کے برگِ گل پر ڈھلنے سے میں یہ سمجھا — جو دیدہ ور ہے اُسکو شوقِ رخِ نکو ہے
سرسبز کیونکے ہووے جادہ کہ رہرووں کو — طولِ امل کا دینا نت مانعِ نمو ہے

سررشتۂ سخن کو قائمؔ اگر تو سمجھے
جو کچھ کہے ہے کوئی اس کی ہی گفتگو ہے

---

تیری زباں سے خستہ کوئی ، زار ہے کوئی
پیارے یہ نحوِ حرف و یہ گفتار ہے کوئی

ٹھوکر میں ہر قدم کی تڑپتے ہیں دل کئی
ظالم اِدھر تو دیکھ، یہ رفتار ہے کوئی

تجھ سے لگیں تھیں[۱] آنکھیں پھنسا مفت میں دل
تقصیر تھی کسی کی ، گرفتار ہے کوئی

جوں شاخِ گل ہے فکر میں میری شکست کی
میرا اگر اس چمن میں ہوادار ہے کوئی

ہر سو لیے پھروں ہوں دلِ خستہ میں بتاں
اس جنس کا بھی تم میں خریدار ہے کوئی

چارہ نہیں ہے جس کا کسو چارہ داں کے پاس
مجھ سا بھی اس جہان میں ناچار ہے کوئی

ظالم خبر تو لے کہیں قائم ہی یہ نہ ہو
نالان و مضطرب بسِ دیوار ہے کوئی

---

کیوں جائے تو چھٹی تیری زلفوں میں پھنسنے کی (کذا)
کہیں لہر اترتی بھی ہے کالے کے ڈسے کی

کیا ہے کہ دل اس زلف سے اب تک نہ پھر آیا
تھی شرط مری اس کی تو اک رات بسے کی

یاں ہم ہیں تو اے چرخ ششش و پنج نہ کرنا
بھیجے ہے بلا بھی کوئی تو پیش بسی کی

نیلم کو نہ کندن پہ یہ جلوہ ہو جو پیارے
ہے حسن ترے منہ پہ سیاہی کا مسی کی

کب گریے سے قائم کو سروکار تھا نس دن
یہ جتنی خرابی ہے سو ٹک تجھ سے ہنسی کی

---

مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجیے
جی دیجیے تو دیجیے پر دل نہ دیجیے

موتی سے آنسوؤں کو نہ کھو رائگاں تو چشم
دولت خدا نے دی بھی تو اتنا نہ پھینکیے

کیا ساغرِ ہلاہل و کیا جامِ آبِ خضر
آ جائے بزمِ دوست میں جو کچھ سو پیجیے

مذہب میں اپنے زندگیِ ننگ کفر ہے
مر جائیے تو نامِ مسیحا نہ لیجیے

---

۱ ل ، تھی

تارِ نفس سے سل نہ سکا زخمِ داغِ دل　　　رشتے سے کیونکے چاک کو شعلے کے سیجیے
پتھر گلا دیے ہیں مرے ہر سخن نے یاں　　　بارے کبھو تو آپ بھی سن کر پسیجیے
قائمؔ یہ کب کہا میں کہ جینا برا ہے، لیک
جینے کے ہیں جو طور، گر اُس طرح جیجیے

---

کس دن مرے جنوں کی خبر دشت تک گئی　　　سُن کر جسے نہ قیس کی چھاتی دلک گئی
برسات کی ہے رات، میں تنہا، تری گلی　　　مارا پڑا ہوں آج جو بجلی چمک گئی
ان خوش بجبوں کی ہائے رے یہ تنگ پوشیاں　　　ذرّہ نہ کسمسائے کہ چولی مسک گئی
نکلے ہے ریم چشم سے میری بجائے اشک　　　بس گریہ تیرے ہاتھ سے چھاتی تو پک گئی
اے ریشِ روسیاہ ترا پیشِ ہوشاں　　　عزت مری سبب سے ترے یاں تلک گئی
کچھ لگ چلا تھا رات میں، بولا کہ خیر ہے　　　حضرت مزاج آپ کی کیدھر بہک گئی
ہمدم نہ پوچھ مجھ سے کچھ اس مغ بچے کا حسن　　　جلوے کو جس کے دخترِ رز دیکھ چھپا سا گئی
ناصح نہیں ہے چشم پہ کچھ حکم تو مرا　　　یہ روسیاہ جن سے کے اٹلی اٹک گئی
قائمؔ شب اس کے گھر میں مرا جی دہل گیا
زنجیرِ در جو باد سے بھی ٹک کھڑک گئی

---

کیونکے تجھ ہجر میں آرام سے سونا ہووے　　　خوب کانٹوں کا نہ جب تک کہ بچھونا ہووے
خاک سمجھا ہے میں سونے کو خوشی سے اپنی　　　ورنہ جس خاک کو یوں ہاتھ میں سونا ہووے
شمع ساں عمر کٹی اپنی تو جلتے ہی یہاں　　　رو چکے کوئی جو اک رات کا رونا ہووے
جیتے جی ہم تو نہ جنت کی طرف میل کریں　　　گور سا بھی جو کہیں مرنے کو کونا ہووے
کل پہ رکھتے ہو مرے قتل کو کاہیکے لیے　　　ہو چکے آج ہی وہ کیوں نہ جو ہونا ہووے

درد میٹھا ہے تنک لون چھڑک سینے میں — خوش لگے ہے جو مٹھائی پہ سلونا ہووے
منع قائمؔ تجھے رونے کو کرے ہے یاں کون
شوق سے رو، نہ جو عالم کو ڈبونا ہووے

---

شب غم سے ترے جان تو پر آن بنی تھی — جو بال بدن پہ ہے سو برچھی کی انی تھی
شب گریے کی وابستہ مری دل شکنی تھی — جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی
بے دردی ہے فرہاد سے نسبت مجھے کرنا — آخر یہ جگر کاوی ہے وہ کوہ کنی تھی
میں کشتہ ہوں اسباب کا تیرے شہدا کے — کر چلتے ہیں کچھ ساتھ لیا بے کفنی تھی
یک عمر رہے[۱] غرق بخوں چاک گریباں — ہم کو بھی کبھو خواہش گل پیرہنی تھی
اب گریہ تعجب ہے تجھے سخت جگر کا — اک وقت تو یاں کان عقیق یمنی تھی
قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

---

مردنِ دشوار نہیں یہ جانِ بے تقصیر ہے — حسرتِ دل سو طرف سے اس کی دامن گیر ہے
خونِ ناحق سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل — غرق آب شرم میں اب تک دم شمشیر ہے
ڈر ستم کرنے سے اے ظالم یہ کچھ لازم نہیں — آہ ہر مظلوم کی میری سی بے تاثیر ہے
گرم رفتن ہوئے[۲] شعلہ قید میں آتا نہیں — موجِ آتش کو سراسر صورتِ زنجیر ہے
کیمیا چاہے ہے گر قائمؔ تو دے دل کو گداز
تک یہ پارا آنچ پر ٹھہرا تو پھر اکسیر ہے

---

۱؎ ل، دیکھے
۲؎ ل، ہو کر

خوب ہی عاشق کو اپنے تم تو بہکاتے رہے
پھر کہاں اور کس جگہ پر اس کو بتلاتے رہے

ہاتھ پھیلائے تو مثلِ برق ملنے کو ترے
پہنچے[1] جب تک، کہ تو، ہم آپ ہی جاتے رہے

تب تو نرمِ تیر سے چلنے میں کچھ باقی تھی
پر نہ جانے کس لیے ہم ٹال کر آتے رہے

شعلہ زن تھی عشق کی آتش زبس سینے میں رات
جل بجھا دل جب تلک، ہم جی کو نکراتے رہے

گم ہوا سر رشتہ ایسا کام کا اپنے کہ آہ
پھر نہ سلجھا جس قدر ہم اس کو سلجھاتے رہے

ہے رفو سے صرف سے جامے کا میرے تار و پود
بس کہ میں پھاڑا اسے اور یار سلواتے رہے

شیخ جی گر امر ہو میں بھی کروں کچھ التماس
آپ تو خاطر میں جو آیا سو فرماتے رہے

اب بھی کچھ جانے تو قائمؔ عشق سے باز آ کہ یار
ایک عالم کے اسی قصے میں گھر جاتے رہے

---

روز و شب ہے حالتِ انجامِ مے نوشی مجھے
کس کی آنکھوں نے کیا پیغامِ بے ہوشی مجھے

گو بظاہر تو گلے لگتا نہیں میرے تو کیا
ہے تصور سے ترے ہر دم ہم آغوشی مجھے

منحصر ہے شرحِ سوزِ دل پہ میری زندگی
شمع ساں مرتا ہوں گر یکدم ہو خاموشی مجھے

---

[1] م، لیکن ایک جھمکے میں ہم تو آپ سے جاتے رہے۔

شب کی ہی بدمستیوں سے ہوں میں ساقی منفعل ۔۔۔ آج تو کرتا ہے پھر تکلیفِ مے نوشی مجھے
منہ سے منہ لگنے کی تا قائم کی تو تھی اُس سے میں گھات
ایک کرنے دے ہے کب وہ شوخ سرگوشی مجھے

---

نہ تنہا ہر لحظ ہر داغِ گلشن ہے ۔۔۔ بہارِ سینہ رشکِ صد چمن ہے
دہن تیرے کو گویا بات کہتے ۔۔۔ ہماری جز رسی میں کیا سخن ہے
یہ صحرا ہے، بھلا دیکھیں تو بارے ۔۔۔ جنوں کیسا ترا دیوانہ پن ہے
نہ جیمِ رخت سے خوش ہو کہ اک روز ۔۔۔ ترا منصب وہی دس گز کفن ہے
وہ گویا زخمِ تبسم ہے چہرے کے اوپر ۔۔۔ جو بے لطفِ سخن کوئی دہن ہے
دلا پوچھ ہم سے احوالِ عمر آباد ۔۔۔ کہ اپنا تو وہی بستی وطن ہے
فقط شاعر نہیں ہم، بلکہ قائم
ہمارا ایک ادنا یہ بھی فن ہے

---

شب تنِ زار نہ آہ کے سر رشتے سے ۔۔۔ سوزنِ گم شدہ جوں آئے نظر رشتے سے
دام کیا کم تھا رگِ گل کا اسیری کو مری ۔۔۔ کہ بندھائے تو فلک در پہ رشتے سے
دل میں آتش کو جگہ دینی سراپا ہے زیاں ۔۔۔ شمع کا داغ نہ ہو کیونکے جگر رشتے سے
کون سا فخر اگر یار ہیں مجھ سے اک جا ۔۔۔ منتظم ہوتی ہی ہے سلکِ گہر رشتے سے
ساتھیاں دم کی کشاکش کے ہیں یوں عقدۂ دل ۔۔۔ دانے ہوں سبحہ کے جوں زیر و زبر رشتے سے
اہلِ جوہر کو مناسب نہیں ناجنس سے ربط ۔۔۔ دمبدم پہنچے ہے گوہر کو ضرر رشتے سے
اہلِ[1] معنی کو ہے کیا صحبتِ ناجنس سے باک ۔۔۔ قند کو کچھ بھی بھلا ہو ہے ضرر رشتے سے

---

[1] یہ شعر ل میں نہیں ہے۔

مر گئے پر بھی نہیں جانے کی قائمؔ یہ مروڑ
وہ جو بل ذات میں ہے جائے کدھر رشتے سے

---

یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہ ہووے
دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

صورت میں تری گر نظر آوے ملک الموت
جی دینا کسو طرح سے دشوار نہ ہووے

بہتر ہے کہ ہو مرغِ دل اور چنگلِ شاہیں
پر دامِ محبت میں گرفتار نہ ہووے

دوراں نہ کرے یار کو محفل کی مری شمع
تا روز مرا مجھ پہ شبِ تار نہ ہووے

پیالے میں جو کچھ سادہ دلی سے یہ کہا ہو
زنہار کہیں غیر سے تکرار نہ ہووے

اپنی تو مجھے فکر کچھ اتنی نہیں لیکن
ڈرتا ہوں کہیں تم سے وہ بیزار نہ ہووے

قائمؔ میں سنے ہیں مرضِ عشق کے احوال
مر جائے تو بہتر یہ یہ آزار نہ ہووے

---

دامانِ گل تئیں ہی کہاں دسترس مجھے
تکلیفِ سیرِ باغ نہ کر اے ہوس مجھے

بھٹکا ہیں وہ نہیں کہ ملوں قافلے سے پھیر
کیوں بیدماغ کرتی ہے بانگِ جرس مجھے

بیگانہ ہو وہ مجھ سے میں جس کا ہوں آشنا
کیا کیجے نہیں ہے مہر و محبت سے جس مجھے

ساقی نہ کھینچ مجھ کو تو مستوں کے دور میں
اک گردشِ نگاہ ہی تیری ہے بس مجھے

میری ازل سے ہے گردِ حزن زندگی
جوں نے دیا ہے نالہ بجائے نفس مجھے

یہ دل وہ جنس ہے کہ دیا گر کہیں اسے
دھڑکا یہی رہا کہ نہ دے بازپس مجھے

قائمؔ میں عندلیبِ خوش آہنگ تھا پہ حیف
زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

---

چشم اگر تا بہ شب یوہیں روؤے — دیکھیے حالِ خلق کیا ہوئے
نہ لگا دل کو اس کی مژگاں سے — اپنے حق میں تو کانٹے مت بوؤے
میں اور اس بت کے دام میں پھنس جاؤں — پر کسی کی خدا نہ مت کھوئے
پاک طینت ہے یاں وہ اے ساقی — جس کے دل کا غبار مے دھوئے
ٹھگ کی گٹھڑی پہ تاک ہے قائمؔ
تو جو اپنی کسی جگہ سووے

---

گو ہم سے تم ملے نہ تو ہم بھی نہ مر گئے — کہنے کو رہ گیا یہ سخن، دن گزر گئے
کس[1] سے سنا ہے تیں کہ یہ ہے خوشدلی کی جا — رنج و تعب ہی ہم نے تو دیکھا جدھر گئے
بھٹکا پھروں ہوں یاں میں اکیلا ہر ایک سمت — اے ہمرہانِ پیش قدم تم کدھر گئے
صیاد اب تو چھوڑ کہ پہنچیں چمن تلک — چھوڑے کا تب کے فایدہ جب بال و پر گئے
روئے گی کب تک اے مژۂ اشکبار بس — اب کیا مجھے ڈبوئے گی جل تھل تو بھر گئے
جی بچ چکا ہے ایسے جھمیوں کے ہاتھ سے — دل دیکھنے کو لے کے جو ظالم مکر گئے
قائمؔ خدا کے واسطے مت گل رخوں سے مل
اس چہ چہے میں یار ہزاروں کے گھر گئے

---

لگ کے پھر دل نہ چھٹے جس سے تنک لاگ لگے — گر ہی کچھ ہے محبت تو اسے آگ لگے
کیا بیاں کیجے تپِ دل کی حقیقت محرم — وہ ہی بجھے ہے اسے جس کو یہ بیراگ لگے
آہ کیا جنسِ وفا جل نہ بجھیں سینے میں — طرح اس گھر کے کہ ناگاہ جسے آگ لگے
عید کا چاند ہوئے نام ہی سن جاہ کا تم — دیکھیں اب اور کوئی روز میں کیا بھاگ لگے
کیا کہوں تجھ سے میاں شیخ کی میں بیسل تنی — خاصے گینڈے ہیں جو پیشانی میں یک کھاگ لگے

---

۱؎ م، کہتے ہیں خوش دلی ہے جہاں میں یہ سب غلط — ل، میں متن میں یہی مصرع درج ہے لیکن اس پر "بدل" لکھ کر حاشیے میں وہ مصرع لکھا گیا ہے جس کو متن میں اختیار کیا گیا ہے۔

کوئی بھی ڈھنگ ہو اُس خستہ کے جینے کا بھن　　　جس کے پیچھے کہ محبت کا تری ڈاگ لگے

قائمؔ استاد گنیے[1] ہم تو فسوں میں تجھ کو
زلف کا اُس کی ترے ہاتھ اگر ناگ لگے

---

جوں طفلِ سرشکِ ارغوانی　　　پامال ہوئی مری جوانی
ہر سانس گراں ہو تن پہ میرے　　　اللہ رے ضعف و ناتوانی
دو چیز ہیں یادگارِ دوراں　　　تیرا ستم، اپنی جانفشانی
ہے رشک مجھے پیام بر تک　　　گو تجھ سے کہے مری زبانی
غافل نہ فلک کو دیکھتا چل　　　نوّابی ہے تجھ کو یا کہ خانی
ہر نقشِ قدم تلے ہے تیرے　　　یاں ابنِ فلاں و داں فلانی

قائمؔ نہ دوائے داغِ دل کر
کیا جانئے ہے کس کی یہ نشانی

---

فہم کے ساتھ جو صناعت[2] ہے　　　اپنے آئین میں وہ طاعت ہے
بعدِ خط اُن سے ہم ملیں گے کہ اب　　　نوبتِ اہلِ استطاعت ہے
بو نہ یاں تخمِ آرزو کہ ہوس　　　کب یہ دل قابلِ زراعت ہے
غیر کی غیر جانے یاں تو میاں　　　ایک بوسے پہ بھی قناعت ہے

قتلِ دشمن ہے کام کیا قائمؔ
مارنا آپ کو شجاعت ہے

---

[1] ل. گنئے　　　[2] ل، سناعت

آمد میں ہیں اشکِ ناتواں کی ٹکڑوں سے جگر کے زدباں کی
دیکھے ہے جو مجھ کو سو ہنسے ہے گویا ہوں میں کشت زعفراں کی
اے دل تو جگہ دے اس کے غم کو حرمت ہے ضرور میہماں کی
بلبل کی مرے صفیرِ جاں سوز ہے برق پر اپنے آشیاں کی
کس کس صورت سے جلوہ گر ہے اللہ رے نمودِ بے نشاں کی
اے گریہ بتا میں اب کروں کیا حالت مری سب پہ تیں عیاں کی
وو کرتے سخن تو میں سہم کر پوچھے تھا یہ بات ہے کہاں کی

اے دل جو یہ پوچھے تجھ سے قائمؔ
تیں شاعری میری امتحاں کی
کہ طوطیِ ہند ہے تو پیارے
کیا پوچھنی ہے تری زباں کی

---

جز سیرِ دل اب اور کتابت نہ سبق ہے جی اٹکے ہے جس میں وہ یہی ایک ورق ہے
مارا ہے وہ کس خستہ کو ایسا کہ مری جان اب تک دمِ شمشیر خجالت سے عرق ہے
ہر چند نشے میں تو کئی ڈول کے ہیں رنگ پر صوفی پینے کی بھی عجب صاف رمق ہے
دیکھو تو یہ خوناب میں ہے داغِ دلِ زار یا مہرِ جہاں سوز چھپا زیرِ شفق ہے
حقا کہ نہیں کچھ حق و باطل سے مجھے کام فرمائیں جو کچھ آپ مرے حق میں وہ حق ہے
گھبرائے ہے جی وسعتِ دل دیکھ کے بُرم اللہ رے یہ دشت بھی کتنا لق ودق ہے

قائمؔ کا بھی کچھ حال سنا تو نے کسو سے
کہتے ہیں کہ آج اس کو نپٹ سخت قلق ہے

---

دل ڈھونڈھنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

کیا پوچھتے ہو موجبِ آزردگیِ یار
دل سے چکے مدت ہوئی اب جاں طلبی ہے

کوچے میں ترے گریہ چلا آئے ہی شاید
مدفون کسی کشتے کی یاں تشنہ لبی ہے

ہے مفت یہ صحبت کہ کوئی دم میں یہ ساقی
نے جامِ بلوریں ہے نہ شیشہ حلبی ہے

قائم نہ رہے کیونکہ ترے سامنے خاموش
جائے کہ تو ہے بات بھی واں بے ادبی ہے

---

کیا لطف ہے واں رہیے جہاں بے مزگی ہے
اے جی تو نکل جلد کہ دل میں خفگی ہے

اُگتے ہیں مری خاک سے گُل حلق بریدہ
شاید کبھو اس کھیت میں تلوار لگی ہے

اللہ رے گُل و لالہ کی اس فصل میں جوشش
اطرافِ گلستاں کو گویا آگ لگی ہے

گر مرد ہے لگ چلنے پہ دنیا کے تو مت بھول
اس قحبہ نے اک خلق اسی طرح ٹھگی ہے

صد بحرِ ہوس موج زن اس دل میں ہیں ہر دم
یکقطرۂ خوں آپ اگرچہ ہمگی ہے

قائم تو یہ اس وضع ہے خوباں کا دوانا
اے نیک خرد کہہ تو یہ کیا مسخرگی ہے

---

سنتا ہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی
گو آپ سفارش کرے اللہ کسی کی

نے نالے میں تاثیر ہے نے آہ میں یاں درد
معلوم ہو کس طرح تجھے چاہ کسی کی

توفیق جو بوسے کی نہیں گالی ہی دو تو
رکھ چھوڑنی کیا خوب ہے تنخواہ کسی کی

پھولوں کی چھڑی ہے یہ ترے ہاتھ میں پیارے
یا لختِ جگر سے ہے گُندھی آہ کسی کی

تھا کس سے یہ وعدہ کہ طرح شمع کے قائم
دیکھا کیے ہم صبح تلک راہ کسی کی

---

کیسے گلگشتِ گلشن کی ہوس ہے — اسیری کا جگر پر داغ بس ہے
جنوں کے ہاتھ سے گو ناتواں ہوں — گریباں تک تو میری دسترس ہے
کوئی ملتا ہے دل تجھ سے وہ گمراہ — عبث نالاں تو مانندِ جرس ہے
نہ پوچھ مجھ سے گلشن کی حقیقت — برس گزرے کہ میں ہوں اور قفس ہے
ہیں خوب و زشتِ باغِ دہر توام — ہمیشہ گردِ گل کے جوشِ خس ہے
ہے میرا نالہ یہ دور از اثر آہ — گویا ہم طائرِ بانگِ جرس ہے
نہ پھٹکے غیر ادھر خطرے سے میرے — کہ ہر دم دزد کو بیمِ عسس ہے

بغیر از آہ و افغاں کون قائمؔ
مرا اس غم کدے میں ہم نفس ہے

---

دوں ہمتوں کے فائدہ کیا اضطراب سے — اک خس کبھو نہ بہ سکے موجِ سراب سے
ایمن زوالِ چرخ سے ہیں نت گرفتہ دل — ہووے نہ خشک آبِ گہر آفتاب سے
غصہ ذلیل کو تہیِ عمر ہے کہ دیکھ — رشتہ ہو صرف آپ ہی میں پیچ و تاب سے
دیں آب نخلِ شعلہ کو آنکھوں سے دل جلے — یہ عقدہ حل کیا ہے میں اشکِ کباب سے
شہرت طلب ہے شیخ تو پی اور پلا شراب — مشہور تر ہے پیرِ مغاں آفتاب سے
ذرہ سا نم سرشک سے میرے گیے جہاں — کمتر ہے واں یہ ہفت فلک اک حباب سے

قائمؔ مقام ہوئے ہر اصومعے کے بیچ
تجھ بن رکھوں جو کام کسی شیخ و شاب سے

---

بانگِ مسجد سے کب اس کو سرِ مانوسی ہے — جس کے کانوں میں بھرا نالۂ ناقوسی ہے

---

لہ م، تجھ بن جو معتقد ہوں کسی شیخ و شاب سے

بے تواضع کے نہ ہو عزّتِ انساں کا نمو — گوئی اس نخل کی بالیدگی معکوسی ہے
اشک سے کیوں نہ مرا راز ہو عالم پہ عیاں — محرمِ خانہ میرے درپۓ جاسوسی ہے
ایک شب جن نے تری بزم میں پائی ہو راہ — شمع کی طرح وہ نت محوِ قدمبوسی ہے
یہ جو امید ہمیں وصل کی تیرے ہے غلط — اے خوشا حال انھیں کا جنھیں مایوسی ہے
حضرتِ شیخ کے رونے پہ نہ جانا تو کہ یہ — زرق ہے، ریو ہے، تزویر ہے، سالوسی ہے
ہیں جو پرواز ترے داغ میں دل کے قائمؔ
ساتھ اس حسن کے کب جلوۂ طاؤسی ہے

---

مت کہہ کہ رات اُس سے وعدہ ٹھہر چکا ہے — ایسے تو وہ ہزاروں اقرار کر چکا ہے
اب چشمِ گریہ پیما صرفہ ہے کیا جہاں کا — سیلابِ خوں سے تیرے جل تھل تو بھر چکا ہے
یوں تم کسی طرح سے دو غیر کو چڑھا دے — اپنی تو وہ نظر سے کب کا اُتر چکا ہے
کہتے ہو دل ادھر دے، تم کیا کروگے دل کو — وہ ہی ہے جو نظر سے آگے گزر چکا ہے
مت جا شمارِ دم پر قائمؔ کے تو کہ پیارے
یہ خستہ فی الحقیقت مدت سے مر چکا ہے

---

کیا جانیے ہم کہاں ہیں اور دین و دل کدھر ہے — عالم میں تفرقے کے کس کی کسے خبر ہے
آرام سے کوئی دم کٹ جائے گر جہاں میں — ہم عمرِ صد خضر کے اک فرصتِ شرر ہے
اس بحر سے اگرچہ جوں موج جائیے ہی تو — پر ساتھ ہے وہ تیرے جیدھر تجھے سفر ہے
جز کاوکن کسی نے حاصل نہ مجھ سے دیکھا — گویا میں ہوں وہ دانہ جو سبز بام پر ہے
ہستی میں ٹھیک کر رکھ راہِ عدم کہ آخر — ایک دن اسی طرف سے کرنا تجھے گزر ہے
گم کر تو آپ کو یاں گر چاہتا ہے کچھ ہو — قطرہ جو خوب ڈوبا اس بحر میں گہر ہے

مجنوں کی حسرتوں کا شاید یہ نوحہ گر ہے　　نالہ جو اس کا لیلیٰ ہے آج گریہ آور
قائمؔ اسی زمیں کو کہتی ہے طبع پھر کہہ
شاید کہ دل میں کوئی مضمونِ شعر تر ہے

---

صد شکر اب طپش سے یاں دل ہر نہ پر ہے　　اے شوقِ پر فشانی کہ تیری کیا خبر ہے
وہ دن گئے کہ لوہو آتا تھا چشمِ تر سے　　اب لختِ دل ہے کوئی یا پارۂ جگر ہے
غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یاں　　ہر سنگ رہ گزر کا دوکانِ شیشہ گر ہے
کب برقِ غم کے صدمے ہر ڈھال پر رکیں یاں　　ایسی ستم کشی کو سینے ہی کی سپر ہے
ہم چشمی غیر کی ہم کب کر سکیں کہ اُس پر　　اتنا تو ہے کہ گاہے دزدیدہ یک نظر ہے
غافل نہ رہیو پیارے عاشق کی دکھ دہی سے　　نالے میں بکسوں کے کہتے ہیں اک اثر ہے
جوں نخلِ شمع قائمؔ یاں وہ نہال ہوں میں
جز اشک و آہ جس کو نے برگ ہے نہ بر ہے

---

جس طرف سے تو مری جان پلک مار چلے　　باپ بیٹے ہوں جو دو شخص تو تلوار چلے
اس چمن کی ہے ہوا سخت مخالف پیارے　　چنگے آئے تھے ترے کوچے میں بیمار چلے
ہر قدم پر ہیں رہِ عشق میں لاکھوں لغزش　　دو ہی تھکتا ہے کوئی گام جو ہشیار چلے
اس جوئے خانے سے مت پوچھ کہ جا ہیں کیونکر　　پونجی لائے تھے کچھ اک در سے یاں ہار چلے
ہم نشیں منع کوئی ہو ہیں ہم اس کوچے سے　　ٹک تو لوگوں کی نظر بچنے دے او یار چلے
قائمؔ آ رختِ سفر باندھ کہ یاں سے اپنا
جی تو جانے کو نہ چاہے تھا پہ ناچار چلے

---

کاہے کو شیخی و ریا چاہیے　　جوں بنے یک چند جیا چاہیے
مال کی دل کے ابھی ہوتی ہے چاہ　　اور کوئی دن نہ دیا چاہیے
پار ہے اس آہ میں کارِ سپہر　　اب کے تنک سانس لیا چاہیے
ہوش کی باقی ہے ہنوز اک خلش　　اور کوئی جام پیا چاہیے
زخمِ دل اُس شوخ سے ہے یادگار　　اس کو تو ناصح نہ سیا چاہیے
عشق تو قائمؔ نہ ہوا آپ سے
اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے

---

آج اے گریہ خبر لے مرے دیوانے کی　　کچھ رکا جائے ہے جی گرد سے ویرانے کی
سایے سے مجھ کو مغیلاں کے تو محروم نہ رکھ　　اے کہ قدرت دی ہے عالم کو تو خس خانے کی
آج کی رات جو اُس گل کا میسر ہو وصال　　شمع روشن میں کروں خاک پہ پروانے کی
رات لیتا ہے زباں شمع کی منہ میں گلگیر　　کیوں نہ پروانہ جلے بات ہی جل جانے کی
شیخ ڈھونڈے ہے جو تیں حضرتِ قائمؔ کو تو دیکھ
اینڈتے ہوں گے کہیں کنج میں میخانے کی

---

شکوہ اغیار سے نے یار کی بیزاری سے　　جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے
ہر قدم کوے بتاں کا رگہِ مینا ہے　　دیکھیو نیچ کے سنبھالے ہوئے ہشیاری سے
رو کے پوچھا میں میسر ہو ترا کیونکے وصال　　ہنس کے کہنے لگا طالع کی مددگاری سے
شور تجھ حسن کا گر عالمِ علوی میں نہیں　　مہر و مہ جھانکے ہیں کیوں پردۂ زنگاری سے
غافل اس لب سے بقدر حذر اولیٰ تر　　گھر اک عالم کا جلا ہے اسی چنگاری سے
اے رے لپٹیں تری زلفوں کی سبحان اللہ　　کم ہیں خوبی میں یہ کس نافۂ تاتاری سے

ارث ٹھہری ہے گویا عشق ہمارے گھر کی
جو موا ہم میں سو آخر اسی بیماری سے

حسن کو تیرے میں یوسف سے مقابل کرتا
کون رو کش ہو پہ ہر سوقی و بازاری سے

مے نہ جس روز میسر ہوا کوئی بنگ کا قرط
کچھ نہ کچھ شغل بھلا ہوئے ہی بیکاری سے

دار سے کا ہے کو منصور نے دیکھا تھا دہ زنج
جو بلا سر پہ مرے آئی ہے ناداری سے

ہائے قائمؔ نہ تری آنکھ پسیجی اک دن
ابر روتا ہے سدا خوفِ سیہ کاری سے

---

کب نالہ بلائے جاں نہیں ہے
کب آفتِ دل فغاں نہیں ہے

کب چشم پہ ناگوار نہیں خواب
کب دل پہ نفس گراں نہیں ہے

ہے کون سا دم کہ تازہ نوحہ
سر جوشِ لب و دہاں نہیں ہے

کس دن تہہِ دل برنگِ اخگر
صد آتشِ غم نہاں نہیں ہے

کب رات ہوئی کہ چشمِ تر سے
خونابۂ دل رواں نہیں ہے

سب کچھ ہے جو چاہیے مگر صبر
اک جنس ہے وہ کہ یاں نہیں ہے

بس تا بہ کجا اٹھائیں یہ غم
کیا ہم ہیں تو ہم میں جاں نہیں ہے

کہتا میں نہیں کہ ظلم ہے بد
پر خوب تو مہرباں نہیں ہے

اُس منہ سے نہ چہرہ ہو تو اے گل
تیرا یہ لب و دہاں نہیں ہے

سو بات کہوں پر اس کے آگے
گویا منہ میں زباں نہیں ہے

یاں تک سویا میں بخت بیدار
کھلی آنکھ تو کارواں نہیں ہے (کذا)

ہوئی جائے ہے رات صبح آماں
پھر ملنے کا دن گماں نہیں ہے

کیا کہتے ہیں ایسی ہٹھ کو پیارے
ہوئی نا تہ، تو پھر ہاں نہیں ہے

قائمؔ سا عزیز خوار ہو حیف
کوئی ہند میں قدرداں نہیں ہے

ممکن نہیں دل سے تاب و تب جائے
شعلے کے جگر سے آگ کب جائے

کب آئے گا پھر وہ اے ہوا خواہ
جاتا ہے اگر کوئی تو اب جائے

پامال کیا جو فوجِ غم نے
دل نام بھی شہر تھا عجب جائے

کو گرد یہ کہ ہے غبار دل پر
کچھ منہ ہو اگر تو گرد دب جائے

جاتا ہے تو جائیو پہ ظالم
دو چار گھڑی تو اور شب جائے

اے غم! ہے یہ دل مقامِ خوباں
ایسا نہ ہو یاں تو بے ادب جائے

میں اور سرِ کوئے یار قائم
گو نام رہے نہ یا نسب جائے

---

ویسی ہی آہ، وہی نالا ہے
اب بھی یاں فضلِ حق تعالیٰ ہے

اے طپش یک دو روز اور بھی صبر
زخمِ دل کا ہنوز آلا ہے

دل ہے یا رب کہ چشمۂ خوں ہے
چشم ہے یا لہو کا نالا ہے

سوزِ پروانہ یوں سنے ہے چراغ
کان میں جیسے تیل ڈالا ہے

اے طلبگارِ منزلِ مقصود
کیوں تو بارِ سفر کو ڈھالا ہے

چشم بر راہ ہوں میں کس گل کی
آج یاں کون آنے والا ہے

گل ہے یہ بھی کہ ہاتھ میں ہو گہر
آج گو پانو بیچ چھالا ہے

نہیں اترتا گلے سے جوں نرگس
منہ میں سونے کا گر نوالا ہے

دیکھ قائم یہ وہ ہے طفلِ سرشک
ہم جسے خونِ دل سے پالا ہے

---

بات جب اُس زبان پہ آئی
تیغ گویا فسان پہ آئی

ہم ہی آئینہ دار تھے اُس کے ۔۔۔ یاں جو طوطی بیان پہ آئی
دیکھیں کرتا ہے کون سینہ سپر ۔۔۔ جب وہ تیغ امتحان پہ آئی
مر کے جلنے کی قدر سمجھے ہے وہ ۔۔۔ جس کے برق آشیان پہ آئی
بل بے جرأت میں رازِ دل نہ کہا ۔۔۔ بات جب تک کہ جان پہ آئی
یوں ہیں طوفاں طراز ہیں جو یہ چشم ۔۔۔ تو پھر آفت جہان پہ آئی
کھل گیا آپ ہی آپ کچھ قائم
کیا بلا اس جوان پہ آئی

---

کوئی اپنی خاطر ایسا کہیں اک مکان ہووے
کہ نہ یہ زمین ہو واں نہ یہ آسمان ہووے
میں کیا تو ہے مس اپنا یہ نمودِ زر سے بہتر
پہ اسی میں خیریت ہے جو نہ امتحان ہووے
رہ و رسمِ ناز پیار سے ہے قدیم طورِ خوباں
پہ نہ اس قدر کہ جی کا کسی کے[1] زیان ہووے
میں تمام رات تجھ بن درِ غیر پر سحر کی
نہ خدا کرے کسی سے کوئی بدگمان ہووے
نہ خفا ہو مجھ سے قائم کہ روا ہے اس سے رنجش
جو کوئی کہ اک دو دم کا کہیں میہمان ہووے

---

[1] ل: کسی کا

گہہ ہوئی صبح گاہ شام ہوئی — عمر انھیں قصّوں میں تمام ہوئی
رنجش آگے جو خاص تھی ہم سے — وائے طالع کہ وہ بھی عام ہوئی
کس گرفتار پہ ہوا ہے یہ قہر — جو بلا مجھ پہ زیرِ دام ہوئی
وہی سمجھے ہے رمزِ حکمتِ عین — جس سے وہ چشم ہم کلام ہوئی
یہ بھی نالے کا طور ہے قائمؔ
خواب اک خلق پہ حرام ہوئی

---

کیا کیا عدم میں ہم پہ ظلم و ستم نہ ہوں گے — چرچے یہی رہیں گے اور ہاے ہم نہ ہوں گے
قلموں کے وصف اس کے چھپ چھپ لکھیں ہیں تو نے — اے خامہ ہاتھ تیرے کیونکر قلم نہ ہوں گے
دریا دلی میں ساقی دیکھی تری کہ تو نے — یہ مے دی جس میں لب بھی اپنے تو نم نہ ہوں گے
یوں مجھ کو قتل کر تو لیکن یہ ہے کہ پیارے — مارے سے ایک میرے عاشق تو کم نہ ہوں گے
صفتِ نظر ہے قائمؔ سیرِ وجود ورنہ
آئے نہیں عدم سے یا پھر عدم نہ ہوں گے

---

جو کچھ کہ اس میں ہو شادی و غم غنیمت ہے — تو بے خبر ہے اس عالم سے دم غنیمت ہے

---

خدا[ل] کسی پہ کسی دل کو مبتلا نہ کرے — یہ ابتلا ہے بُری طرح کا خدا نہ کرے
بجھا نہ جل کے کوئی لعلِ آتشیں سے ترے — کسی کے دل میں الٰہی یہ آگ جا نہ کرے
کہیں سنا ہے کہ رنجورِ عشق کو ہو شفا — کہو طبیب سے اس درد کی دوا نہ کرے

---

ل م: خدا کسی سے کسی دل کو آشنا نہ کرے۔

ہم اپنے وعدے کے دن بھر چلے اب اے ظالم — تو گو وفا کرے وعدے کو اپنے یا نہ کرے
کسی بلا میں پھنسے، قید ہوئے، جان سے جائے — پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے
ہزار شکل سے سمجھاؤں میں تجھے اے دل — پر اس کو کیا کروں ظالم جو تو کہا نہ کرے
پھنسا جو کوئی کہ اس دام میں وہ پھر نہ چھٹا — خدا کسی کو گرفتار زلف کا نہ کرے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائمؔ
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں، خدا نہ کرے

---

تا مژہ دل سے پھر اب اشک کا نم پہنچا ہے — چشم بد دور، عجب شغل بہم پہنچا ہے
دیرِ[1] دل سے تو ہم آگہ نہیں، پر سنتے ہیں — یاں سے جو قافلہ بھولا سو حرم پہنچا ہے
بے سبب تو نہیں احوال یہ دل کا پیارے — تو بھی تو پوچھ کہ کیا اس پہ ستم پہنچا ہے
سالک اُس وادیِ پُر خوف کا ہو میں کہ کوئی — آگے جس رہ میں مقصود کو کم پہنچا ہے

یہ کب اعجاز تجھے موسیٰ کے عصا میں قائمؔ
جن مراتب کو ترا آج قلم پہنچا ہے

---

اُس طرف وہ نگاہ لڑتی ہے — کبھو ایدھر بھی آن پڑتی ہے
کس کی مژگاں پھریں کہ نوکِ نفس — پھانس سی کچھ جگر میں گڑتی ہے
زور بستی تھی دل کبھی، لیکن حیف — بے رئیس ان دنوں اجڑتی ہے
گو کہے شیخ، نوچی ریش مری — ایسی باتوں سے کیا اُکھڑتی ہے
کیا ہی کھڑا ہے وہ کہ جس کے حضور — آئینے کی قلعی اُکھڑتی ہے

---

[1] م، دیرِ دل جانئے کیدھر ہے پہ یہ سنتے ہیں۔

کھول ٹک زلف تو کہ سنبل آج  اپنی خوبی پہ جد اکڑتی ہے

قائمؔ آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر
دیکھیں کس کس سے اب بگڑتی ہے

---

گو کہیں یار، بلا یا ہے وہ اب آتا ہے  لیک ایسے میں تو سمجھتا ہوں کہ آتا ہے
دن کی آفت تو گزر جاتی ہے جوں توں محرم  رات اک آتے (ہی) اک مجھ پہ غضب آتا ہے
کیونکے مانوں میں پڑے ہاتھ کسی کا اُس پہ  مجھ سے بیباک کو جس سے کہ ادب آتا ہے
زیست اُن کی ہے بکام اہلِ جہاں میں محرم  جن کو خوباں کے ملانے کا ڈھب آتا ہے (کذا)
شام[1] ہوتی نہیں، اک دل پہ بلا ہوتی ہے  صبح آتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے
لگ[2] چلی کرتے ہیں کس طرح بتاں سے محرم  میں تو اس ڈول سے واقف، نہ مجھے ڈھب آتا ہے
قائمؔ[3] آنا ہے تجھے مدہوش کرے مستیِ عشق  ہم کو تو ہوش سے تیرے یہ عجب آتا ہے

ہے عجب حال ترا عشقِ بتاں میں قائمؔ
کہ جسے دیکھ کے عالم کو عجب آتا ہے

---

زاہد، دیرِ مسجد پہ خرابات کی تو نے  جی بھی یونہیں چاہے تھا کرامات کی تو نے
جانے دے بس اب یار کہ یہ بھی نہیں کچھ کم  اعمال کی دل کے جو مکافات کی تو نے
ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر، نہ جانے  اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے
اللہ رے محبت تری تعلیم کہ[4] جو بات  دشوار[5] تھی مجھ پر سو مساوات کی تو نے
قائمؔ رہِ پرخوف ہے اور دور ہے منزل  کب پہنچے گا ظالم جو یہیں رات کی تو نے

---

۱ ۲ ۳ یہ شعر ل میں نہیں ہیں۔
۴ م، کہ یکبار
۵ م، جو شاق تھی مجھ پر سو

تا اُس کمر کے غم سے کیا مثلِ مو مجھے — کھو یا وہ جائے اب جو کہے جست و جو مجھے
ہمت مری ہوئی نہ کسی مرتبے میں بند — کیا جانے کس مقام کی تھی آرزو مجھے
آخر تو جرمِ عشق سے کرتے ہیں مجھ کو قتل — یکبار اس کے بھی تو کریں روبرو مجھے
یاں چاہیے ہے زینتِ (ظاہر) کسے کہ ہو — عریاں تنی میں مثلِ گہر آبرو مجھے
رووُں نہ مثلِ شیشہ میں ہچکی چھٹ ایک اشک — رکھتا ہے بس کہ گریہ گرہ در گلو مجھے
مانگوں نہ ت اٹھ کے موت میں اپنی ترے حضور — اتنا[۲] تو مت بتنگ کر اے تند خو مجھے
کم ظرف اک دو ساغرِ مے سے کریں ہیں دھوم — بھر دے نہ مثلِ شیشہ تو یاں تا گلو مجھے

قائم ترے تو ننگ سے دوزخ میں ہوں ہیں آج
لے جائے گا بہشت میں کیا کل کو تو مجھے

---

کریں ہم یاد کس کس گلستاں کی — فلک کیا کیا بہاریں ہیں خزاں کی
کہیں ہوتے ہیں تجھ سے چشمِ بد دور — میں کی ہے مدتوں خدمت بتاں کی
نکالا ہے نہ ہم نے عشق میں نام — یہ فن ہے ارث اپنے خانداں کی
نہ ہو یا قوت، تو کس کام کا ڈانک — ہے خوبی تجھ لبوں سے رنگِ یاں کی
چلا جاتا ہے جی باتوں میں تیری — خصوصیت ہے یہ تیرے بتیاں[۳] کی
نہیں تن پر مرے اک زخم کی جا — کوئی یہ بھی طرح ہے امتحاں کی

جو قائمؔ خوبیِ کونین ہے قصد
تو خدمت کر محمد یار خاں کی

---

[۱] م: اپنے یک سے آپ تو نادم نہ ہو کہیں

[۲] م: اتنا بھی مت — [۳] ل: میں "بتاں" ہے۔ قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

فلک رلائے تو ہے ہم کو ایک یہ ڈر ہے
کہ بلبلا سا کہیں آپ بھی بہا نہ پھرے

گلی میں جائیو اس کی سمجھ کے تو کہ نسیم
یہی وہ جا ہے جہاں کا کوئی گیا نہ پھرے

خزاں میں سوء مروت ہے چھوڑنا گلشن
ہم اور رہولے چمن جب تلک ہوا نہ پھرے

ہزار حیف کہ گلچیں ہے اُس جگہ گستاخ
میں جس چمن میں یہ چاہے تھا یاں صبا نہ پھرے

یقیں ہے گور پہ آئیں گے اب تری قائمؔ
جو جیتے جی کبھو بالیں پر بھی آ نہ پھرے

---

عجب اک پیچ و خم کے ساتھ اس عارض پہ رو[1] واں ہے
تماشا آتش کہ جس کے گرد اس خوبی سے دھو[1] واں ہے

---

پھروہی[2] دم کو ترے چرخ اثر دیتا ہے
مژدہ اے نالہ کہ عاشق یہ خبر دیتا ہے

کاہے کو دیکھیے زمانے سے تمتع کی امید
بخت دیتا نہیں جس کو یہ ہنر دیتا ہے

واے[3] غفلت کہ ہے واں قتل کو خنجر کی تلاش
مور یہ خوش کہ زمانہ مجھے پر دیتا ہے

یوں حباب اپنا فلک تازہ بنا دیجیے گا
فرصت اک دم بھی ہمیں چرخ اگر دیتا ہے

آگ نالے سے بھڑکے تھی تو اچنبھا کیا ہے
یاں ہے جو نخل سو اپنا ہی ثمر دیتا ہے

گریۂ ابر بھی اک چیز ہے پیارے لیکن
داد رونے کی مرا دیدۂ تر دیتا ہے

عشق کا داغ نہ کہ کیونکے سہا جاتا ہے
داغ جو دے ہے وہی شخص جگر دیتا ہے

---

[1] ن، میں "رو ناں" اور "دھو ناں" ہے۔
[2] م، آج کل تجھ کو فلک گنج و گہر دیتا ہے — مژدہ اے شورغ کہ عاشق یہ خبر دیتا ہے
[3] م، واے غفلت کہ وہ کاڑھے ہے بغل میں خنجر

بارور نخل سے سیکھے کوئی احساں کا طریق — سنگ مارے ہے جو اس کو وہ ثمر دیتا ہے

عقدہ ہستی کا یہ کھلنا نہیں قائمؔ آساں
وہ ہی سمجھے ہے خدا جس کو نظر دیتا ہے

---

یہ نیست و ہست اے دل سب وہم ہی تیرا ہے
جب تھا تو کبھو[۱] کیا تھا اور اب نہیں تو کیا ہے
اس کا وہ نمط جس سے باندھے کوئی گلدستہ
گو ہیچ ہوں پر مجھ سے جمعیتِ دلہا ہے
یوں آدمی کہلاوے ہر گربہ و سگ لیکن
جس سے کہ عبارت ہے انسان وہ عنقا ہے
دل فائدہ اٹھ اٹھ کر دروازے تلک جانا
آنا ہے جسے ہم تک وہ آپ ہی آتا ہے
سن شور میں عالم کا یاں موندے ہیں کان اپنے
پر خوب جو دیکھا میں کچھ آپہی میں غوغا ہے
اتنا تو دکھے ہے دل نالاں نہ ہو سو کیونکر
یہ رسم ہے کچھ جس کو ہو درد وہ روتا ہے
قائمؔ ترے مرنے سے ہے[۲] پرغمیں سارا گھر
کہہ تو بھی اے ظالم کیا تجھ کو تمنا ہے

---

۱ م، تو بھلا کیا تھا۔
۲ م، ہے نزع میں

جی گو تجھے پیارا نہیں ہے — پر اتنا بھی تو ناکارا نہیں ہے
اکثر خوبرو اوباش لیکن — کوئی تجھ سا تو آوارا نہیں ہے
دل لے کر ہوئے منکر تم اس طرح — میاں ہم نے بھی کچھ ہارا نہیں ہے
زاروں آرزو دل میں گرہ ہے — یہ کہنے کا ہمیں یارا نہیں ہے

نہ مرنے دیتے ہم قائمؔ کو لیکن
خدا وندی سے کچھ چارا نہیں ہے

---

نہ اک خوں سے مرے دیوار و در بھیگے ہوئے
کوہ بھی مثلِ شفق ہیں تا کمر بھیگے ہوئے
میدگاہِ عشق میں کیا قدر اس بسمل کو ہے
ہوں نہ جس کے خوں میں اپنے بال و پر بھیگے ہوئے
جسم سے اس نوکِ مژگاں کے جیسے عاشق سو گیا
ہیں کسی زہراب میں یہ نیشتر بھیگے ہوئے
ثِ عصیاں سے ہے کیا نقصانِ اربابِ صفا
آب میں ہیں غرق پر کب ہیں گہر بھیگے ہوئے

گریہ قائمؔ گو تھما مژگاں ابھی ہوں گی نہ خشک
منہ کے پیچھے دیر ٹپکے ہیں شجر بھیگے ہوئے

---

کیا دل غمزدہ ہوگا تو جسے شاد کرے — یوں تری بندہ نوازی جو کبھو یاد کرے
ہے جو شیریں تجھے خسرو ہی کی جانب منظور — تو عبث کوہکنی کاہے کو فرہاد کرے
صبر کر کنج قفس بیچ کہ اے مرغِ اسیر — رسم نہیں یاں کہ کسی کو کوئی آزاد کرے

درد و غم داغ ہر اک کا ہے مجھے پاسِ مزاج جوں کوئی شخص نئے شہر کو آباد کرے
یاں[1] جو حاکم ہے سو محکوم محبت تیرا کس کے آگے کوئی جا کر تری فریاد کرے
مر تو گئے دام میں رک رک کے اب آگے قائمؔ
کیا کوئی شکوۂ بدخوئی صیاد کرے

---

دیکھتے غیر کے مری اس سے نگاہ لڑ گئی کام بھی چل چل ہوا بات ہی سب بگڑ گئی
ڈالے تو ہے ہوس تو ہاتھ اس کی کمر میں پہ ابھی نکلے ہے یہ مصاحبت، چین اگر اُدھڑ گئی
پوچھے ہے کیا تو ہم نشیں دل کی خرابی کا بیاں بستی تو خوب تھی یہ لیک ظلم ستی اُجڑ گئی
زاہدِ خشک کا مرے ڈول بندھا تھا ایک نگ سو وہ بیان کشف میں شیخی تمام جھڑ گئی
کون ہے قائمؔ اس جگہ جس کو نہیں کسی سے ربط
میری ہی چاہ کی فقط شہر میں دھوم پڑ گئی

---

رکھے تھا صبر کا دعویٰ تری بیداد کے آگے کیا تھا جو سو آیا اس دلِ ناشاد کے آگے
خدا جانے ترا دل کس طرح کا سنگ ہے ورنہ ہو زہرہ آب پتھر کا مری فریاد کے آگے
نہیں ہے جوہرِ ہستی مرا تعطیل کے قابل خدا جانے کہ کیا صورت تھی اس ایجاد کے آگے
سنا ہے میں کہ دھمکاتا تھا زاہد دخترِ رز کو کبھو بولے نہ کچھ آ کر کسی داماد کے آگے
پیام آتے ہیں مجھ سے مور بے پر کی طرف ہر دم سلیماں بات ہے کیا ہے تری تو باد کے آگے
ترے پاؤں میں مر کر جن نے عمر جاوداں پائی وہ سر کیونکر جھکے گر دونِ بے بنیاد کے آگے
امیرؔ اب اور قائمؔ سا نہیں ہے ہند میں شاعر
کہ زانو تہ کی اُن نے تجھ سے اک اُستاد کے آگے

---

[1] م: حاکم اور قاضی جو ہے عاشق دوالہ تیرا

اٹھا دے ستم یا جفا کیا کرے | بچارا یہ دل ایک کیا کیا کرے
میں جاتا ہوں کعبے کو اب دیر سے | بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے
پھرا مدتوں سر پہ میرے وہ خوار | پہ طالع نہ ہوں تو ہما کیا کرے
ہیں گو لاکھ شکوے لبوں میں گرہ | پہ تجھ سے کہا کوئی گلا کیا کرے

ہے قائمؔ مجھے عشق سے درد دل
طبیب اس مرض کی دوا کیا کرے

---

عوض امید کے پھر دل کو یاس آئی ہے | عجب زمانے نے جی سے خلش مٹائی ہے
جو پوچھے تو بھی دنیا کا حال مجھ سے تو پوچھ | کہ ایک عمر میں یہ فاحشہ رسائی ہے
یہ کیا نصیب کہ پوچھے وہ ہم نشیں مجھ کو | صحیح[1] تو یوں ہے کہ یہ بات تیں بنائی ہے
صلاح شیخ کے گو معترف ہوں عامی شہر | یہ ہم تو جانے ہیں جیسی کہ پارسائی ہے
جو چاہے تو کہ کسی سے میں آشنا ہوں بدل | تو اس سے مل کہ جسے دل سے آشنائی ہے
اب عندلیب جو چاہے سو کہہ پہ سچ تو یہ ہے | ہمیں سے طرز یہ نالے کی تیں اڑائی ہے

کرے ہے بخل کریموں کا یاں طلب کو دوچند
سوالِ بوسہ بھی قائمؔ عجب گدائی ہے

---

جو کترا خطِ پشت لب کو تیں، عالم ہوا راضی
بلے شیریں ہے ہر یک طبع میں حلوائے مقراضی
وہ کیا اک بوسہ جس پر رات تم نے ہم سے منہ موڑا
میاں بیٹھو نہ بس دیکھی تمھاری ہم نے فیاضی

---

[1] ل میں "سچی" ہے۔

خوشا حال اُن حریفوں کا کہ جن کا وقت یوں گزرا
کہ اندیشہ نہ استقبال کا نے قصّۂ ماضی

طبیب اس کو کہوں میں جو مرے احوال کو پہنچے
رکھے ہیں یوں تو اس فرقے میں سب دعوائے نباضی

نہیں جز نالہ کوئی دمساز اپنا بلکہ اکثر تو
غلط ہے یہ جو میں کہتا ہوں نالے کی بھی دمسازی

می و معشوق سے قائمؔ اگر خوش ہے تو وہ جانے
مجھے کیا کام ان قصّوں سے میں مُلّا ہوں یا قاضی

---

جو دیکھتے ہو اس میں خیالات و خواب ہے — دنیا بھی اک نمونۂ موج سراب ہے
کہنے لگا طبیب مرا یہ عذاب دیکھ — مرنا ہی اس مریض کے حق میں صواب ہے
ہوتی نہیں شمارِ نفس میں کہیں تمام — یارب یہ شب مری ہے کہ روزِ حساب ہے
کس رو سے کچھ سوال کروں میں کہ ہمنشیں — اکثر مرے جواب کا یاں تو جواب ہے
تعمیر کیونکے کیجیے ویراں سرائے دل — اک گھر ہے یہ کہ لاکھوں جگہ سے خراب ہے
نقطے سے خالِ گوشۂ ابرو کے ہے عیاں — دیوان حسن بیچ یہ بیت انتخاب ہے

قائمؔ عبث ہے قصدِ رہائی کہ مثلِ موج
جب تک کہ تو ہے ساتھ ترے پیچ و تاب ہے

---

نسبت ہے آفتاب کو کیا روئے یار سے — ہے فرق شمعِ بزم کو شمعِ مزار سے
[1] تا ہٹنے کے ساتھ ابھی جان ہے ہوا — پیچیش نہ کر نسیم ہمارے غبار سے

---

[1] یہ شعر ل، میں نہیں ہے۔

اے دیر جلوہ رحم کہ مانندِ آئنہ
پتھرا چلی ہیں چشم مری انتظار سے

دامانِ شیخ نیفے سے اونچے ہوئے تو کیا
لٹکی پڑے ہے چولی تو نیچے ازار سے

مدِ نظر یہاں جگر خوں شدہ کے داغ
تسکین جی کو اپنے ہو کس لالہ زار سے

دیکھا میں یاں تو بخت نے کچھ یاوری کی
ناچار چلیے اور کہیں اس دیار سے

قائمؔ نہیں یہ سختی دوراں دردزہ بیش
کرتا ہے کیوں گلہ تو غمِ روزگار سے

---

کرو ہو یوں سے کا وعدہ تم آج اشاروں سے
یہ چھیڑ کیا ہے بھلا ہم خدا کے ماروں سے

نکل کے ابر سے کہتی ہے برق خندہ زناں
کہ خوبروئیں گریزاں سیاہ کاروں سے

ہو ورع یوں تو عجب کچھ پہ عفوِ حق کے تئیں
معاملہ ہے نرالا گناہ گاروں سے

عرق کی منہ پہ ترے یہ بہار ہے کہ گویا
جڑاؤ ماہ کے اوپر کیا ہے تاروں سے

نہ شیخ منکرِ مے ہو کہ دیدہ ور ہیں جو مرد
طلب کریں ہیں وہ ہمت شرابخواروں سے

کھلی گہر کی نہ جب ناخنِ صدف سے گرہ
کشادِ کار کی پھر کیا طمع ہو یاروں سے

وہ چشم آبلہ پھوٹی ہی خوب ہے قائمؔ
کہ جس کے گرد نہ مژگاں اگی ہوں خاروں سے

---

مرے حال سے وہ بت آگاہ کیا ہے
جو گزرے ہے مجھ پہ خدا جانتا ہے

نہ بالیدہ ہستی پہ اپنی ہو غافل
کہ یہ بلبلا کوئی دم میں ہوا ہے

سنا ہے گل زعفراں سے یہ میں نے
ہنسا وہ گیا جو کسی کو ہنسا ہے

نہ کر تکیہ حسنِ عمل پہ کہ زاہد
یہ کس کو خبر ہے کہ انجام کیا ہے

دلا شکوہ کرتا ہے کیا بے بسی کا
نہیں ہے کوئی جس کا اس کا خدا ہے

نہ کر تفرقہ صاف و درد جہاں میں — جو کچھ تجکو ساقی دے سو واہ وا ہے
کسی در سے آویش تو ساتھ میرے — جو مرضی تری اس میں میری رضا ہے
نہ میں عشق چھوڑا، نہ تیں جور پیارے — مجھے آفریں اور تجھے مرحبا ہے
جو بے عشق ہے وہ نہیں ہم سے قائمؔ
گھرانے میں اپنے کسو کی دعا ہے

---

وہ بھی کیا دن تھے کہ جی کو لاگ اُس کے ساتھ تھی
میں تھا اور کوچہ تھا اُس کا اور اندھیری رات تھی
گوشِ شنوا جب بہم پہنچا نہ کوئی یاں تو آہ
لے گئے ہم ساتھ اپنے وہ جو دل میں بات تھی
چاہ تھا رونے کا بن روزوں میں اپنی چشم کو
کھول کر آنکھیں جدھر دیکھے تھا میں برسات تھی
کھائیو مت بولی دنیا کی جو شش پُر فریب
ایک دن ایسی ہی ہم سے گرم یہ بدذات تھی
قائمؔ اس جینے پہ کوئی دم کے منصوبے ہیں کیا
جب تلک مہرے پٹینے گا تو یہ بازی مات تھی

---

نہ پوچھو کہ قائمؔ کا کیا حال ہے — کچھ اک ڈھیر ہڈیوں کا یا کھال ہے
جو بیٹھے تو ہے روے قالیں کا نقش — کھڑا ہو تو کاغذ کی تمثال ہے
کھٹکتا ہے پہلو میں یوں ہم نشیں — کہے تو یہ دل تیر کی بھال ہے
گرفتار ہے جو تری زلف کا — وہ ہر قید سے فارغ البال ہے

اٹھا روند ڈالے اک عالم کے دل — بھلا شوخ یہ بھی کوئی چال ہے
الجھتا ہے جی شیخ کی ریش دیکھ — وہ سچ ہے مثل بال جنجال ہے
دھڑکنے کا دل پر ہے گاہے ہجوم — گہے چشم گریے کی پامال ہے
یہ گویا دیہ دولتِ عشق ہے — دل و دیدہ سامان گھڑیال ہے

خوش آئی ہے قائمؔ یہی گر زمیں
تو پھر کہہ نہ مضموں کا کیا کال ہے

---

کہیں امتحاں ہو تو جنجال ہے — تو کھوٹا ہے اور دہر ٹکسال ہے
نہ جانے پسِ پردہ بستا ہو کون — کہ یاں ہر دم اک شورِ خلخال ہے
پیالے ہے گل ہاتھ سب کے حضور — ہوا زر تو کیا جی تو کنگال ہے
نہ کھٹکے کسی چشم میں راست رو — حریف کج آنکھوں میں پربال ہے
گیا کون سا گل چمن سے کہ آج — جو بلبل ہے واں سر تہِ بال ہے
نہ اک چھن رہا ہے ستاروں سے چرخ — ترے غم میں ہر سینہ غربال ہے
تلے آسماں کے بجز مار روک (کذا) — کوئی شخص ہو زیست اشکال ہے
نہیں دیکھتا چاند کے حال کو — کبھو تیغ ہے اور کبھو ڈھال ہے

نہ کھا اس کی باتوں پہ قائمؔ فریب
یہ بوسے کا وعدہ نہیں ٹال ہے

---

ہے وہ تجھ میں واسطے جس کے تو اس خواری میں ہے
پر خدا جانے کہ تو کس کی طلبگاری میں ہے
جز و کل کے فرق پر مت جا ٹک اک آتش کو دیکھ
ہے جو تودے میں وہی ذرّہ سی چنگاری میں ہے

قصر شاہ و کلبۂ درویش میں راحت کہاں
یہ مزا اپنی ہی ٹوٹی چار دیواری میں ہے
اصل فتویٰ اپنے مذہب میں ہے مے پر اے فقیہ
بنگ و بوزا تو یونہیں اک وقتِ ناچاری میں ہے
لے سکے قائمؔ سے جو کچھ لے جیک اے ناداں شتاب
وہ مسافر آج کل چلنے کی تیاری میں ہے

---

ہم نے تو خبر اس لبِ شیریں کی نہ پائی — اک دیر سے کھاتے ہیں یونہیں یار مٹھائی
جھپکی تھی تنک چشم ابھی اے دلِ ناداں — سوتی ہوئی یہ راز تو ناحق کو جگائی
کب گریۂ شبنم پہ دلِ غنچہ ہوا نرم — رو کر کے عبث کیجیے کیوں لوک ہنسائی
اے چشم تو نشتر وہ کرے صرف نہ اشک — اس خرج کی ہے آپ کو کب عہدہ برائی
جھگڑے کوئی چکتے ہیں اس آنے سے تمھارے — آئے کہ دوہیں اٹھ گئے دیکر کے جھکائی
بے جوشِ سرشک آتشِ دل بجھتی ہے کوئی — اس تھوڑے سے رونے نے تو اور آگ لگائی
نہ دیں سے ہوا مجھ کو نہ دنیا سے نصیبہ — یک عمر تری راہ میں کیا مفت گنوائی
کیا جانیے چھٹیں قید سے کب چرخ کی قائمؔ
بے طرح یہ خاک اب تو بگولے میں گھر آئی

---

تو اپنی سی دل کی خو نہ سمجھے — یہ بگڑے تو پھر کبھو نہ سمجھے
تھی خیر یہی کہ رات پیارے — تم غیر کی گفتگو نہ سمجھے
سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو — پر حیف کہ رو برو نہ سمجھے
اک عرض تو تھی پر اس سے پیارے — کیا کہیے جو بات کو نہ سمجھے

قسمت کہ وہ چارہ گر ہے اپنا ‏ ‏ جو زخم سے تا رفو نہ سمجھے
سو حرف ہیں خامشی میں لیکن ‏ ‏ اس بات کو ہرزہ گو نہ سمجھے
شایانِ چمن. نہیں وہ بلبل ‏ ‏ ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے
وہ آج ہمیں ہیں محو ساقی ‏ ‏ جو جام سے تا سبو نہ سمجھے
سمجھا رہے ہم تو تجھ کو قائمؔ
پر کیجیے کیا جو تو نہ سمجھے

---

کر فخر ہائے مجھ سے ہر دگر عار ہے مجھ سے ‏ ‏ ہر جنس کی یاں گرمیِ بازار ہے مجھ سے
احساس نہیں خلق کی نظروں میں وگرنہ ‏ ‏ جوں شمع یہ سب بزم نمودار ہے مجھ سے
جوں رشتہ تو کمزور سا مت دیکھیو مجھ کو ‏ ‏ مضبوطی ہر سبحہ و زنّار رہے مجھ سے
حیوان و گیاہ راکع و ساجد نہیں بے وجہ ‏ ‏ ہر بے خبرِ خلق خبردار رہے مجھ سے
کس مہر نے یاں جلوہ گری کی ہے کہ قائمؔ
ذرات دو عالم کو سروکار ہے مجھ سے

---

حالِ دل صبح و شام کیا کہیے ‏ ‏ اک قصہ مدام کیا کہیے
غم کی چیٹک نہ ہوئے جس دل میں ‏ ‏ سنگ اسے یا رخام کیا کہیے
کی کٹی جیوں تیوں کے جس سے رات بسر ‏ ‏ پھیر آئی وہ شام کیا کہیے
جو پھنسا یاں سو پھر موا نہ چھٹا ‏ ‏ زلف یا اس کو دام کیا کہیے
کر دیا اک جہان تہ و بالا ‏ ‏ عشق کی دھوم دھام کیا کہیے
میری اب تک پھرے ہے آنکھوں میں ‏ ‏ ہائے رے وہ خرام کیا کہیے
آپ ہی چلیے کہ آگے قاصد کے ‏ ‏ یار کا ہے پیام کیا کہیے

جانیے کیا ہے کیا نہیں قاصد　　چلیے آپ ہی، سلام کیا کہیے
دو نہ قائم کو ہاتھ سے کہ میاں
ہے سو ہے وہ غلام کیا کہیے

---

آج ناداں حسن پر جس تن کے تو مغرور ہے
کل وہ طعمۂ کرم کا ہے اور غذائے مور ہے
چشمِ پُرخوں سے مری ہو آنسوؤں کو کیوں نہ انس
خانۂ زنگیں سے الفت طفل کی مشہور ہے
شیخ جیو مانا میں اس کو تم فرشتہ ہو تو ہو
لیک حضرت آدمی ہونا نہایت دور ہے
جب تلک کوچے میں ہے اس شوخ کے یہ مشتِ خاک
بھول کر آوے نسیم اس راہ کیا مقدور ہے
لو جو شیشہ دل کا لیتے ہو پہ اتنا ہے کہ شوخ
ایک ذرّہ ٹھیس اسے لاگی تو چکنا چور ہے
ڈریے چشمِ سرمہ گوں سے خوبرویوں کی کہ زہر
بے طرح ہے اس میں خاک آلود جو زنبور ہے
دیکھیے جب چشم کو رونے پہ کافر چور ہے
ہے درایہ سیل کا لوہو ہے یا ناسور ہے
دین سے بہرہ نہ کچھ مجھ کو نہ دنیا سے نصیب
جانیے اس خلقتِ ناقص سے کیا منظور ہے

---

۱ ۲ ۳ یہ شعر ل، میں نہیں ہیں۔

زلف[1] میں لپٹا وہ مکھڑا دیکھ کر گھبرائی خلق
چاند ہے اس میں تو یہ کیسی شب دیجور ہے
دشت[2] صنعت نے جسے چاہا بنایا اس طرح
روئے ہے کیوں شبنم اور گل کس لیے مسرور ہے
موسم[3] افسردگی میں جلوہ دے ہے داغِ عشق
کیا ہوا گر شمع سر سے پانو تک کافور ہے
سچ کہہ اے قائم پھر آگے کیا قیامت ہوگا تو
اس بڑھاپے میں تو تیرے سر میں اتنا شور ہے

---

مرا پیغامبر طرزِ ادائے راز کیا سمجھے — خدا جانے کہ یہ کیا بولے وہ طناز کیا سمجھے

---

کس طرح سے ماہِ نو انجم کے عقدے وا کرے — ہوں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

---

افغان و آہ کشتۂ بیداد کیا کرے — جو قتل ہو چکا ہو سو فریاد کیا کرے
خسرو کے ساتھ شیریں تو مخلوط رہ چلے — یہ کہہ کہ تیرے ہجر میں فرہاد کیا کرے

---

شب روز دل کو اپنے ہے سر حکایت اس سے
کبھو شکر ہے تو اس کا ہے دگر شکایت اس سے
وہ تسلے ہے یک نگہ کو دو جہاں اب آگے عاشق
ہے تری یہ کاردانی کرے جو کفایت اس سے

---

[1] [2] [3] یہ شعر 'ل' میں نہیں ہیں۔

گھر آچکا میں تو نہ پھرا اُس کی راہ سے — کہ دیجو اے صبا دل غیرت پناہ سے

---

رخصت ہو تم تو ودوں گئے ہم یوں چلے گئے — کب کے ہم آچکے پہ سجن تم بھلے گئے
فرصت نہ زلزلے کے تئیں دیں گے ایک دم — گر ہم سے بیقرار زمیں کے تلے گئے
معمور دل سے قصر بہت، ایک تجھ بغیر — پھوٹے ڈہے خرابی میں آئے چلے گئے
اس سبزے کی طرح سے کہ ہو رہگزار پر — روندن میں ایک خلق کی یاں ہم ملے گئے

قائمؔ شباب ہی کے مناسب تھا شور عشق
جانے دے اب یہ کام کہ وہ ولولے گئے

---

کمال نطق میں عیسیٰ بھلا تجھی سا ہے — عجب وہ خر ہیں جو تجھ کو کہیں ہیں عیسیٰ ہے
روش سے چرخ کی ایمن نہ ہو کا ایک جہاں — اس آسیا نے یوہیں کروڑوں میں پیسا ہے

---

ہمارے سوز دل کو شمع کا شعلہ جو سنتا ہے — کبھی ملتا ہی ہاتھوں کے تئیں گہ سر کو دھنتا ہے
بچھاتا ہے جو تانا حیرت خطِ شعاعی کا — نہ جانے کس کی خاطر جامۂ زرتار بنتا ہے
صفائے حسن نے تیری کیا دیوانہ یہ اس کو — کہ دیکھو کہربا کو جس جگہ تنکے ہی چنتا ہے
جلا ہوں میں نہ تنہا رشک سے آتش کے تیرے — ہزاروں دل پڑا اس آگ پر دن رات بھنتا ہے

ہوا کیا گر بظاہر خوب ہے احوال قائمؔ کا
وہ باطن میں تو تجھ بن طرح سے لکڑی کے گھنتا ہے

---

شب جو ہم تجھ بن دل بیتاب کو تھامے رہے
صبح تک باہم عجب قصے و ہنگامے رہے

چل ہوا اے باغ جو یاں سے کہ تھے آگے سو اب
گل ہی وہ گلشن میں باقی ہیں نہ وہ شامے ہے ہے
شوق دل کا یں کچھ اک کرتا تھا شب کاغذ پہ ثبت
تھک گئے لکھنے میں ہاتھ اور ہاتھ سے خامے ہے ہے
دیکھیو آیا وہ بت جب راہ مسجد سے تو شیخ
ساتھ ہیں ننگے سر اور حجروں میں عمامے ہے ہے
گر یوہیں قائمؔ کرے ہے مشق ظلم اس کی نگاہ
میں یہ لکھ دوں گر کوئی یاں آدمی نامے ہے ہے

---

ہم سے تو ترک کوئے یار ہو سکے، یہ نہ ہو سکے
ایسے مقام سے کنار ہو سکے، یہ نہ ہو سکے
وعدۂ سلسبیل پر ہم سے تو آج واعظا
ترک شراب خوشگوار ہو سکے، یہ نہ ہو سکے
چشم براہ ہوں روز و شب، جیسے میں ہجر میں ترے
اور سے تو یہ انتظار ہو سکے، یہ نہ ہو سکے
شعلے میں گو سکون آئے، برق سے اضطراب جائے
پر دلِ زار کو قرار ہو سکے، یہ نہ ہو سکے
جائے ہے قائمؔ اس جگہ تو ہی یہ ذلتیں اٹھائے
اپنی تو آنکھ پھر دو چار ہو سکے، یہ نہ ہو سکے

---

کون سا اہلِ صفا آلودگی سے پاک ہے　　آبِ آئینہ بھی جوہر سے پُر از خاشاک ہے

بادِ پر بنیاد ہے اس ہستیِ بے بود کی ایک ذرہ دم اگر چوکے تو پھر کیا خاک ہے
دعویٰ خوں کی شہادت آپ دے ہی روزِ حشر کیا کہوں قاتل مرا کس مرتبہ بے باک ہے
کون تشنہ لب موا ہے یاں کہ جس کے غم میں آہ سو جگہ سے ریگِ صحرا کا گریباں چاک ہے
دشمنی سے ایک ادنا کی ہے قائمؔ جائے خوف
وائے اُس پر جس کسی سے خصمیِ افلاک ہے

---

نہ اے بے مہر مجھ پر ایک تو ہی بر سرِ کیں ہے
ہمیشہ ابروئے شمشیر بھی جوہر سے پُر چیں ہے
ڈر آہِ خستگاں سے تو کہ ہنگامِ دعا اُن کے
حریمِ قدس میں لاکھوں ملایک محو آمیں ہے
کہوں کیا دل پہ جو ایذا ہے اُس مژگاں کے ہاتھوں سے
وہ مرغ اِس دکھ کو سمجھے جو اسیرِ چنگِ شاہیں ہے
یہ شوخی رنگ کی پیارے کہاں پائی ہے مہندی نے
نہ جانے ہاتھ تیرا خوں سے کس بیکس کے رنگیں ہے
نہ اے مشّاطہ آئینہ دکھا کر مجھ سے کھو اُس کو
کہ اغوا سے ترے پہلے ہی بہتیرا وہ خود بیں ہے
دوانہ ہوں میں اربابِ جہاں کی حسِّ شامہ کا
کہ جیسا عنبر ان کے روبرو ویسا ہی سرگیں ہے
نہ اک قائمؔ غمیں ہے تو ہی غم میں عشق کے تنہا
یہ وہ غم ہے کہ اک عالم اسی غم سے غمگیں ہے

---

کس دل پہ داغ غم نے نہ تیرے بہار کی — اللہ رے دھوم اب کے برس لالہ زار کی
گر وہ اگر یہی ہیں جہاں کے تو لاکھ بار — افزوں ہو عمر خضر سے فرصت شرار کی
شاید وہ بھول کر کبھی یاں بھی رکھے قدم — یکساں کرو زمین ہمارے مزار کی
آوارگانِ غم کے سروں پر نہ جان بال — نکلی ہیں سر سے پھوٹ کے نوکیں یہ خار کی
وعدہ یہ کل کے آنے کا اس سخت جاں سے کر — طاقت ہو جس کسی کو ترے انتظار کی
صبح و شفق کی ہوئے ہو کب مل کے یہ نمود — اس لب پہ جو بہار ہے خط کے غبار کی
دامان جاں جو کھینچے ہو گرد اس زمیں کی یوں — مقتل کی جا ہو آہ یہ کس خاکسار کی
قائم صبا سے اہلِ چمن نے اگر کہیں (ق) آمد سنی نہیں ہے مرے گلعذار کی
غنچے نے کس کے بوسے کو یہ لب کیے ہیں جمع — گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

---

زیادہ چشم سے ابرو تری پیارے ستمگر ہے — ابھی کو میں تو ردتا تھا یہ کچھ اس سے بھی اوپر ہے
دلیل راہ سے مرنے میں فارغ جان مضطر ہے — کہ جانے کے لیے برق اپنے آپ ہی صورت در ہے
کھلا ہو در ترے منہ پر اگر چشم تنا سا کا — تو ہر ذرے کا روزن مشرقِ خورشیدِ انور ہے
مجھے مارے ہو تو مژگاں کو اپنے سونپ یہ قصہ — کہ سر تیز اس قدر کا ہو کہ پیارے نوکِ خنجر ہے
عبث شادی یوہیں لینے کا دل کے قصد کرتی ہو — میں ساری عمر سے واقف ہوں یہ اندوہ کا گھر ہے
ہوا ہے قدر سے غنچے کی دل پر صاف یہ عقدہ — کہ سر پر جا ہے اسکی جس کسی کی گانٹھ میں زر ہے

جلے ہے دل پڑا سینے میں نت اس طرح سے قائم
کہے تو آگ کے تودے میں پوشیدہ اک اخگر ہے

---

توقع بعد خط تھی اُس سے ہم کو کامیابی کی
پہ کیا کہیے نہایت موت نے اپنی شتابی کی

اگر ہیں اہلِ دل یاں پردہ دارِ رازِ میخواراں
تو ہر دم جام سے کیا ہے یہ سرگوشی گلابی کی
ہو عزت صفحۂ سادہ کی جوں آیاتِ قرآں سے
ہوئی تعظیم خط سے اور اس ردئے کتابی کی
پڑے ہیں ہر طرف یاں شیشۂ دل سیکڑوں ٹوٹے
نہ جانے کس کی چشمِ مست نے یہ بدشرابی کی
طرح اس مرغ کے جو آ کے زیرِ دام تڑپے ہے
پھنسا اس زلف میں دونا میں جوں جوں اضطرابی کی
انیندی چشم کو نرگس کی اُس مستی سے کیا نسبت
ہے کیفیت تری آنکھوں میں جو کچھ نیم خوابی کی
ہزاروں دل گھر تو قائم عشق نے آ گے اُجاڑے ہیں
پہ نے اس طرح سے جیسی مری خانہ خرابی کی

---

ہے جو دم مفلس کے جی پر نزع سے دشوار ہے
ہر نفس ہے دار اس کو جو کوئی نادار ہے
داوری گاہ جزا میں ہر عمل کو ہے عوض
وائے اس پر جو کسی کے درپے آزار ہے
عشق ان دریا کشوں کو ہے کہ جن کا پی کے مے
جوں حباب و موج کہیں سر ہے کہیں دستار ہے
گر یہی ناسازی دیں ہے تو اک دن شیخ جی
پھر وہی ہم ہیں، وہی بت ہے، وہی زنار ہے

پار ہونے کا عبث اس بحر کے رکھتا ہے قصد
وار کہتے ہیں جسے اودھر سے یہ بھی پار ہے

اس تجاہل پر میں مرتا ہوں کہ سب کچھ جان بوجھ
ہر کسی سے پوچھتے ہو تم، یہ کیا بیمار ہے

اُس تپ و لرزے میں لے خورشید اک تو ہی نہیں
گردش دوراں میں دیکھا جس کو میں بیمار ہے

غور سے جامے میں تن کا حسن اس کے کر خیال
سرسری یہ بات نہیں قائمؔ تنک تہ دار ہے

---

شہا کچھ کام کا بندہ ہے یہ یا ہیچ کارا ہے
تمھیں معلوم ہے جیسا کہ ہے لیکن تمھارا ہے

یہ ظاہر دیدۂ بینا پہ دعوئے سلونی سے
کہ عالم میں جو کچھ پنہاں ہے تم پر آشکارا ہے

کمانِ چرخ کی کیا تاب ادھر تیرِ قضا پھینکے
میں واقف ہوں یہ جس گوشے کا ابرو کے اشارا ہے

کرے ہے سعی تو اے ناخدا کس کی رہائی کی
میں غرق اس بحر میں ہوں جس کا ناپیدا کنارا ہے

تھی شیریں والۂ فرہاد اُس خسرو کی ثروت پہ
یہ جی کی چاہ ہے اس میں کسی کا کیا اجارا ہے

---

١؎ یہ شعر ل میں نہیں ہے۔

غلط اندازی زہر محبت کا میں بندہ ہوں
کہ اس تلخی پہ یہ کتنا طبیعت پر گوارا ہے
خیال اس شوخ کا کب دل میں رکتا ہے یہ اے محرم
نہ جانے اس پری کو کیوں کے شیشہ میں اتارا ہے
نہ قائمؔ دین میں رکھتا ہے کوئی جا نہ دنیا میں
تمھارے ہی کرم کا اس کو یا مولا سہارا ہے

---

شادی وعیش وہ یا رنج وعنا دیتا ہے
لے تو دل کھول کے جو تجھ کو خدا دیتا ہے
جب وہ برقع رُخِ روشن سے اُٹھا دیتا ہے
مہر کو چشمِ خلائق سے چھپا دیتا ہے
ہوئیں طالع تو عدو کیا ہے کہ آئینے کو
مہر تاباں کے، دم صبح جلا دیتا ہے
دے، کہ دینا ہے بہرحال وہ بہتر کہ گدا
گر نہیں دینے کو کچھ پاس، دعا دیتا ہے
آہ کر آہ کہ ہو دامنِ تر کا چارہ
رخت نم دیدہ کو ہر شخص ہوا دیتا ہے
کیوں نہ دشنام پس از بوسہ خوش آئے محرم
چرپرا بعد مٹھائی کے مزا دیتا ہے
ہے مرا کام طبیب اب کوئی دم میں آخر
میں یہ حیراں ہوں کہ کس کو تو دوا دیتا ہے

میں تو بیچوں ہوں یہ دل نیم نگہ پر پیارے
تو بھی خواہاں ہے تو کچھ بول کہ کیا دیتا ہے
بات کے رتبے کو پہنچے ہے وہ تیری قائم
جس کسی کو کہ خدا طبع رسا دیتا ہے

---

دل کو بھا نسا ہے ہر اک عضو کی تیرے چھب سے
ہاتھ نے پانو نے مکھڑے نے دہن نے لب نے
بات جی کی تھی سو جی ہی میں رہی مرتے تک
رخصت اظہار کی پائی نہ مرے مطلب نے
رات تھی وصل کی کچھ چاو نکلتے جی کے
لیک کیا کیجے نہایت ہی کمی کی شب نے
تھا تو بالیدہ صفا اپنی پہ موتی کا حباب
خوب اسے صاف اتارا یہ تری غبغب نے
قائم اغیار کے اغوا نے بگاڑی شب بات
ورنہ کچھ کچھ تو وہ ان روزوں لگا تھا ڈھبنے